www.kitabmart.in

سلسلہ اشاعت امامیہ مشن نمبر ۸۱۱

اُصول و ارکانِ دین

رشحاتِ قلم

سرکار آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی النقوی طاب ثراہ

امامیہ مشن علی گڑھ

www.kitabmart.in

سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن لکھنؤ ۸۱۱

اُصولُ و ارکانِ دین

(دوسرا ایڈیشن)

یعنی

قرآن عقل اور تعلیمات اہلبیت نبوی کی روشنی میں
اساسی عقائد جو "اصول دین" کہلاتے ہیں اور
عملی اہم فرائض جو "فروع دین" کہلاتے ہیں۔

از قلم

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء الحاج مولانا السید علی نقی النقوی طاب ثراہ مجتہد العصر

قیمت =/15

www.kitabmart.in

مطبوعہ:
کتاب کار
ریلوے برج۔ جی ٹی روڈ علی گڑھ
فون نمبر ۲۲۱۳۲

www.kitabmart.in

۷۸۶

تعارف

امامیہ مشن کی اشاعت ۶۵۰ / ۷ "اصول وارکانِ دین" کے عنوان سے محرم ۱۳۹۳ھ (فروری ۱۹۷۳ء) میں سید ابن حسین صاحب نقوی مرحوم سابق سیکریٹری، امامیہ مشن نے شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں سرکار آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء طاب ثراہ نے اصول دین و فروع دین کو ایک ساتھ جمع فرمایا ہے۔

اس کتاب کی افادیت کے پیش نظر اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے تاکہ اس سے بچوں کو خصوصیت سے افادہ حاصل ہو سکے۔

اختصار سرکار مرحوم کی وہ خصوصیت ہے جو کم اہلِ قلم کو نصیب ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ کم الفاظ میں مفہوم پورا ادا ہو جاتا ہے، یہ سرکار مرحوم کی تقریر و تحریر دونوں میں یکساں نمایاں ہے۔

الداعی الی الخیر

خادمِ ملت

سید تفسیر الحسن نقوی

آنریری سیکریٹری

امامیہ مشن

۷/ انیشنل کالونی

سول لائنس علی گڑھ

محرم ۱۴۱۳ھ جولائی ۱۹۹۲ء

www.kitabmart.in

تعارف

امامیہ مشن نے اس کے پہلے "اصول دین" اور "فروع دین" میں مختصر رسائل کا ایک سلسلہ شائع کیا تھا جو ملک میں بہت مقبول ہوا۔ یہ رسائل اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔

ان رسائل کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں سے ہر موضوع پر اپنی لائنوں نیز کئی سو صفحات کی کتاب بھی لکھی جا سکتی ہے جن پر صرف ۱۶-۱۶ صفحہ کے رسائل لکھ دیئے گئے ہیں

یہ رسائل صرف عوام کو مذہب سے واقف بنانے کا ہی ذریعہ نہ تھے، بلکہ وہ آئندہ مصنف کیلئے ایک مستقل سرمایہ ہیں اور ہر ایک موضوع پر تصنیفات کی وہ ایک ایسی داغ بیل کی حیثیت رکھتے ہیں، جس پر عمارت اٹھانا ہر ایک کیلئے بہت آسان ہو سکتا ہے اور اسمیں سرکار سید العلماء مدظلہ کے انداز فکر اور اسلوب بیان کی وہ انفرادیت کارفرما ہے جو ان کی مختصر سے مختصر تحریر کو بھی کافی وزنی بنا دیتی ہے۔

اب ان تمام رسائل کو جمع کر کے سرکار ممدوح کی نظر ثانی کے بعد ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ طلاب کو نصاب تعلیم میں ان کا درس حاصل کرنے میں آسانی ہو۔

اس کتاب کی اشاعت جناب غلام محمد صاحب دام ظلہ کشمیری کے ایک گرانقدر عطیہ کے ذریعہ انجام کو پہونچی ہے ہم ان کے طول عمر اور توفیقات میں اضافہ کیلئے بحق آلِ یٰسین علیہم السلام درگاہ احدیت میں دست بدعا ہیں۔

محرم الحرام ۱۳۹۳ھ
فروری ۱۹۷۳ء

خادم ملت
سید ابن حسین نقوی عفی عنہ
آنریری سکریٹری امامیہ مشن۔ لکھنؤ ۳

www.kitabmart.in

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین
وآلہ الطیبین الطاہرین

مقدمہ

دین یعنی وہ نظام تصور و عمل جسے اُس کی حقانیت کی بنا پر نجاتِ آخرت کے مقصد سے اختیار کیا جائے۔

اس میں کچھ "فکر و نظر" سے متعلق باتیں ہوتی ہیں جن میں انسان کا کام انھیں سمجھنا اور سمجھ کر ان کی حقانیت کو ماننا ہے۔ اس ماننے کو "اعتقاد" کہتے ہیں اور کچھ عمل سے متعلق چیزیں ہیں یعنی اس مذہب کے وہ اہم تعلیمات جن پر کاربند ہونا انسان کے لیے ضروری ہے۔

اصطلاحی طور پر جن اہم باتوں سے اعتقاد کا تعلق ہے وہ "اصول دین" کہلاتی ہیں اور جن عملی فرائض پر کاربند ہونا لازم ہے وہ "فروع دین" ہیں۔

یہ اصطلاح اس لحاظ سے بالکل درست ہے کہ جس طرح اصول یعنی جڑوں ہی سے فروع یعنی شاخیں درخت کی روئیدہ ہوتی ہیں اسی طرح ان عقائد کی بنا پر ان احکام کی پابندی انسان کو لازم ہوتی ہے اور جس طرح جڑیں زمین کے اندر ہوتی ہیں۔ اور آنکھوں کو جو نظر آتی ہیں وہ شاخیں، اسی طرح عقائد کے رگ و ریشے دل و دماغ کے اندر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور افعال و اعمال جو اعضا و جوارح سے تعلق رکھتے ہیں، آنکھوں کے

www.kitabmart.in

سامنے آتے ہیں۔

ان دو پہلوؤں سے یہ اصطلاح بالکل درست ہے اور اس لئے ہم بھی اس کتاب کو دو حصوں پر تقسیم کرتے ہیں۔ ایک اصول دین اور دوسرے فروع دین۔ مگر معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن مجید اور مستند احادیث میں ہمیں اصول اور فروع کی تفریق نظر نہیں آتی بلکہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جب کسی نے اسلام کی تعلیم حاصل کرنا چاہی تو حضرت نے اللہ اور روز آخرت پر ایمان کے ساتھ ساتھ نماز وغیرہ کا نام لیا اور مشہور و معروف حدیث جس میں نماز اور روزہ وغیرہ کا شمار کرایا گیا ہے، اس میں ارشاد ہوا ہے۔ بنی الاسلام علی خمس اسلام کی عمارت ان پانچ چیزوں پر قائم ہے جو نماز وغیرہ ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ جو "فروعی" کی لفظ کہہ کے فرائض کی اہمیت گھٹاتے ہیں وہ غلط ہے۔ بلکہ فرائض کی اہمیت کا انکار اس طرح کہ ان کے ضروری و لازم ہونے کا انکار کیا جائے باجماع علماء کفر کا باعث ہے۔

اسی لئے کتاب کے نام میں ہم نے "اصول و فروع" کے بجائے "اصول و ارکان" کی لفظ استعمال کی ہے واللہ الھادی الی سواء السبیل

علی نقی النقوی

۱۷ رجب ۱۳۹۰ھ

www.kitabmart.in

اصولِ دین

مذہب شیعہ کے رو سے "اصول دین" یعنی جن باتوں کے ماننے پر نجات اخروی کا انحصار ہے پانچ ہیں (۱) **توحید** (۲) **عدل** (۳) **نبوت** (۴) **امامت** (۵) **قیامت**۔

ان میں سے تین یعنی توحید۔ نبوت اور قیامت ضروریات دین اسلام ہیں کہ ان کے انکار سے انسان خارج از اسلام ہو جائے گا اور دو یعنی عدل اور امامت ضروریات مذہب شیعہ ہیں کہ ان کے انکار سے خارج از تشیع ہوگا مگر شریعت کے عام قانون کے لحاظ سے خارج از اسلام قرار نہیں پائیگا

(۱) توحید

تمام کائنات کے ایک اکیلے خالق کی ذات کو اس کی شایانِ شان صفات کے ساتھ ماننے کا نام "توحید" ہے۔

ایک وقت تھا جب دنیا معبودوں کی کثرت پر نازاں تھی مگر اسلام ہمیشہ سے اس کی وحدت کا علم بردار رہا اور پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ؐ نے اس وحدت کا پرچار کچھ اتنی شدت و قوت کے ساتھ کیا کہ آج دنیا کے مذاہب کسی نہ کسی شکل میں موحد ہونے کے دعویدار ہیں۔ اگرچہ حقیقی توحید اب بھی اس حقیقی اسلام ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس کی اہلبیت رسول ؐ نے جو ان کے حقیقی جانشین تھے تعلیم دی ہے

www.kitabmart.in

خالق کا وجود

ہر نقش اپنے نقاش کا، ہر تصنیف اپنے مصنف کا، اور ہر عمارت اپنے معمار کا پتہ دیتی ہے اسی طرح اس کائنات عالم کا ہر ذرہ اس کا گواہ ہے کہ اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔

اسے ایک معمولی دماغ والا بچہ اور سطحی نگاہ رکھنے والا آدمی اپنی زبان میں سمجھ سکتا ہے اور اسی کو ایک فلسفی اپنے علمی اصطلاحات سے ثابت کرتا ہے جو عوام کو ایک پیچیدہ مسئلہ معلوم ہونے لگتی ہیں مگر بات یہی ایک ہے کہ اثر بغیر موثر کے نہیں ہوتا اور صنعت بغیر صناع کے وجود میں نہیں آسکتی لہذا یہ کائنات بغیر کسی خالق کے نہیں ہو سکتی

خالق اور اس کی ہستی

"ہم" اور "ہماری ہستی" الگ الگ ہیں اسی لئے ہم میں "نیستی" کا گذر ہے اور ہم کو "ہست" بنانے کیلئے خالق کی ضرورت ہے ایسے ہی "عالم امکان" کی تمام کائنات ہے اور یہی اس کے احتیاج کا راز ہے۔ اگر خالق ایسا ہی ہوا کہ اس کی ذات اور اس کی ہستی الگ الگ ہیں تو پھر اسمیں بھی نیستی کا گذر ہوگا اور وہ خود اسی عالم امکاں کا ایک جز ہو جائے گا لہذا اس سب کا خالق نہ ہو سکیگا۔

وہ سب کا خالق ہے لہذا ماننا پڑیگا کہ اس کی ذات سراسر ہستی ہے اور اس پر نیستی کا گذر نہیں ہے۔

اسی کو علمی اصطلاح میں یوں کہتے ہیں کہ وہ "واجب الوجود" ہے اس کے

www.kitabmart.in

علاوہ جتنی کائنات ہے ان سب کو "ممکنات" کہتے ہیں۔ ممکنات سب اپنے وجود میں خالق کے محتاج ہیں اور خالق "واجب الوجود" ہے اس لیے وہ ذاتاً بے نیاز ہے، کسی شے کا محتاج نہیں ہے۔

صفات ثبوتیہ و سلبیہ

معلوم ہونا چاہیے کہ جتنی برائیاں، جتنے نقائص اور جتنے عیوب ہوتے ہیں وہ سب "نیستی" کے تحت میں داخل ہیں۔ ہم میں نیستی کا گذر ہے اس لئے ہم میں نقائص کا دور دورہ ہے۔ ہستی ہماری اپنی نہیں، یہی سب سے بڑا وہ نقص ہے جس سے تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جتنا درجہ ہستی کا ہماری بلند ہوتا ہے خوبیاں اور کمالات ہمارے لئے حاصل ہو سکتے ہیں۔ خالق کی ذات سراسر ہستی ہی ہستی ہے اس لیے وہ ذاتاً کامل ہے اس میں نقائص کا گذر نہیں۔ بس یہی اس کے صفات ثبوتیہ اور سلبیہ کا ماحصل ہے

اس کے یہاں ذات کے علاوہ صفات کا تصور نہیں ہے۔

قدیم، ازلی، ابدی اور سرمدی

عالم امکان کی ہر شے سے ہستی الگ چیز ہے اس لیئے وہ اس سے پہلے بھی جدا تھی اور بعد میں بھی جدا ہو سکتی ہے اسی سے اس کو "حادث و فانی" کہتے ہیں۔

خالق کی ذات سے ہستی الگ نہیں، لہذا وہ اس سے نہ پہلے کبھی جدا

www.kitabmart.in

تھی اور نہ بعد کو کبھی جدا ہو سکتی ہے اس لیے وہ قدیم اور ازلی ہے
یعنی ہمیشہ سے ہے اور باقی و ابدی ہے یعنی ہمیشہ رہے گا۔ ازلی اور ابدی
دونوں کے مجموعہ کو (یعنی جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا) دائم و سرمدی
کہتے ہیں۔

قادر

قدرت کمال ہے اور عاجزی نقص ہے۔ خالق کی ذات تمام نقائص
سے دور ہے اس لیے وہ عجز سے بھی بری ہے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے
ہاں جو بات صلاحیت وجود رکھتی ہی نہ ہو یعنی عقلاً محال ہو اس
سے قدرت متعلق نہیں ہو سکتی مگر یہ فاعل کا قصور نہیں بلکہ اس شے کا نقص
ہے کہ وہ صلاحیت وجود سے محروم ہے

عالم

عاجزی ہی کی طرح جہالت نقص ہے اس لیے خالق کی ذات جہل سے
بھی بری ہے اور اس کو عالم ماننا ضروری ہے
خود اس کے مخلوقات میں علم و شعور کا پایا جانا بھی اس کی دلیل ہے
کہ خالق ان کمالات پر حاوی ہے اور صنعتوں میں بے مثال تناسب
نظم، ترتیب اور حکم و مصالح کا لحاظ بھی پتہ دیتا ہے کہ وہ ایک باشعور
اور دانا ذات کی کار فرمائی کا نتیجہ ہیں

حی

علم اور قدرت کے اجتماع ہی سے حیات کا تصور بھی وابستہ ہے

www.kitabmart.in

رده" وہی ہوگا جو علم وقدرت سے محروم ہے۔ خالق اس نقص
سے بری ہے

مرید

نظام کائنات کے مصالح کے علم اور اسی کے مطابق قدرت
کی کار فرمائی کا نام "ارادہ" ہے۔

خالق عالم علم اور قدرت کا مالک ہے اس لیے ارادہ کے
ساتھ افعال عمل میں لاتا ہے۔

مُدرک، سمیع وبصیر اور حاضر وناظر

"ادراک" محسوسات کے علم کا نام ہے اور اسی کے تحت میں
سمیع وبصیر ہوتا ہے۔ یہ دونوں لفظیں قرآن کریم میں خالق کے لیے
صرف ہوی ہیں۔ یہ بھی علم کے مفہوم میں داخل ہیں

جن چیزوں کا علم کسی کو دیکھ یا سن کر یا کسی ذریعہ سے ہوتا ہے اُن
سب چیزوں سے خالق واقف ہے

سمیع وبصیر کے یہی معنی ہیں۔ حاضر وناظر کا بھی یہی مطلب ہے کہ وہ
ہمارے تمام حالات سے بغیر ذرائع خبر رسانی کے آگاہ ہے۔

متکلم

وہ جس طرح سب چیزوں کا خالق ہے ویسے ہی جب جس چیز میں

چاہتا ہے کلام خلق فرما دیتا ہے جیسے حضرت موسیٰؑ کے لیے درخت
کلام پیدا کیا۔ اسی کو متکلم کہتے ہیں۔

صادق

جو کلام اُس کے ارادۂ خاص سے پیدا ہوتا ہے اُس کا کوئی ج
خلاف واقعہ اور غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ ایک بُرائی ہے اور اس
ذات ہر برائی سے پاک ہے صادق ہونے کا یہی مطلب ہے۔

احاطہ ممکن نہیں

خالق کے کمال ذات کا احاطہ چند اوصاف میں ممکن نہیں۔ مسلمانو
کے ایک فرقہ نے چونکہ ذات الٰہی کے لیے یہ آٹھ صفتیں قرار دی
اور انھیں ذات کے علاوہ قدیم مانا ہے اس لئے ضرورت ہوئی کہ ا
اوصاف کا عنوان قرار دے کر تعلیمات اہلبیتؑ کی روشنی میں اُن
صحیح نوعیت پیش کر دی جائے ورنہ دراصل مقام حقیقت میں وہاں
ذات ہی ذات ہے۔ اس کے علاوہ صفات کوئی چیز نہیں ہیں اور
کمال کے لحاظ سے پھر اس کے صفات کا حد و حصر ہی ممکن نہیں۔ آٹھ
تعداد قرار دینے کے کیا معنی ہیں؟

صفات سلبیہ

یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ خالق کی ذات میں نقص کا گذر نہیں اور تمام

www.kitabmart.in

نقائص نیستی سے وابستہ ہیں، اُس لئے اس کی ذات تمام نقائص سے بری
۔ ذیل کی باتیں نقائص میں سے ہیں اس لئے وہ ان سے بری ہے۔

(۱) جسمیت

جسم محدود، پابند سمت وجہت، محتاج مکاں اور مرکب ہوتا ہے۔
یہ تمام باتیں بے نیاز خالق کی شان کے خلاف ہیں اس لئے یہ ماننا ضروری
ہے کہ وہ جسم نہیں ہے۔

(۲) مرکب نہیں

جو مرکب ہوگا وہ اجزا کا محتاج ہوگا اس لئے جو ذات واجب الوجود اور
قدیم و ازلی ہو وہ مرکب نہیں ہو سکتی۔

(۳) مکان نہیں رکھتا

مکان میں وہ ہوتا ہے جو جسم ہو اور محدود ہو۔ یہ نفی جسمیت ہی میں
کہا جا چکا کہ وہ ہر قسم کی احتیاج سے بری ہے اس لئے اُسے لامکاں ماننا
ضروری ہے۔

(۴) حلول نہیں

حلول کے معنی یہ ہیں کہ ایک شے دوسرے کی صفت بن کر وجود میں
آئے جیسے سیاہی جسم میں۔ اس صورت میں وہ اس دوسرے کی محتاج
ہوگی جس میں اس کا حلول ہے اور خالق ہر قسم کی احتیاج سے بالاتر ہے
لہٰذا اس کا حلول کسی شے میں ممکن نہیں۔

www.kitabmart.in

(۵) اتحاد نہیں

اتحاد کے معنی یہ ہیں کہ دو چیزیں ایک ہو جائیں اس طرح کہ اشارہ
اس کی طرف کیا جائے وہ اس کی طرف بھی ہو خالق کے سوا ہر شے
حادث اور محتاج ہے۔ اگر ذات خالق اس کے ساتھ متحد ہو جا
تو وہ بھی ان نقائص سے آلودہ ہو جائے گا اور یہ ممکن نہیں ہے۔

(۶) مرئی نہیں

مرئی یعنی جو آنکھ سے دکھائی دے وہ اس چیز کا رنگ اور شکل
ہے جو از قبیل اجسام ہو اور مکان وجہت میں محدود ہو۔ خالق نہ جسم
نہ مکان وجہت میں محدود ہے نہ اس کے لئے رنگ اور شکل ہو سکتی
پھر اس کی رویت کیونکر ممکن ہے۔

اس کو نہ دیکھ سکنا اگر ہمارے "تاب نظارہ" کی کمی سے ہوتا تو
تھا کہ کبھی ہم اتنی ترقی کر جائیں کہ اسے دیکھ سکیں لیکن جبکہ یہ اس
ذات کی بلندی کے سبب سے ہے تو اس میں دنیا و آخرت، آج اور قیا
کی تفریق کے کوئی معنی نہیں کیونکہ اس کی بلندی دلکمال ذات پر زمان
مکان کے تفرقہ کا اثر پڑنا غیر ممکن ہے۔

(۷) محل حوادث نہیں

یعنی اس کی ذات تغیر سے بری ہے کیونکہ تغیر شان امکان
اور امکان ذات واجب کے خلاف

www.kitabmart.in

(۸) صفتیں اُس کی ذات سے علیحدہ نہیں

اس کا بیان پہلے ہو چکا ہے -

اسم ذات

وہی خالق کائنات جو واجب الوجود ہر کمال کا مرکز اور ہر قسم کے نقص سے بری ہے اسی کا خصوصی نام اللہ ہے جس سے ہوا اس کے کسی دوسرے کا موسوم کرنا صحیح و جائز نہیں ہے -

توحید کے عملی اثرات

"توحید" ہمارے نظام زندگی کی اصل اصول اور بنیاد اساسی ہے اس سے تمام عالم انسانیت کے لیے ایک مشترک نقطہ کا یقین پیدا ہوتا ہے جو سب کا مرکز قرار پائے، ہزار در ہزار نسل، وطن، قوم اور رنگ وغیرہ کے تفرقوں کے باوجود اس ایک ہستی کے اقرار سے جو سب کا خالق اور معبود ہے دُنیا ایک نظام میں منسلک ہو جاتی ہے -

اس کے علاوہ یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہم مطلق العنان نہیں ہیں اگر ہر ایک شخص ذاتی خواہشوں کا غلام ہو جائے تو چونکہ ہر ایک کی خواہش اور طبیعت کے تقاضے الگ الگ ہیں لہذا ان میں تصادم لازمی ہے مگر یہ سمجھنے کے بعد کہ ہم سب ایک حاکم کے فرمان بردار ہیں جس کے مقاصد کی تکمیل ہم میں سے ہر ایک کا فریضہ اور اس کے مقاصد تمام نوع انسانی کی بہبودی

www.kitabmart.in

کے متعلق متحد ہیں تو اس کے بعد ہم سب کا آہنگ عمل بھی بہبودی کائنات میں متحد ہونا چاہیئے۔

وہ حاکم کیسا ہے؟ حاضر و ناظر یعنی ہر جگہ موجود اور ہر بات کا جاننے والا۔ اس سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ انسان کوئی بات اکیلے میں بھی اس کے قانون کے خلاف بجا نہ لائے کسی کام کو چوری چھپے کر کے مطمئن نہ ہو جائے کہ کسی نے نہیں دیکھا کیونکہ کوئی اور دیکھے یا نہ دیکھے وہ ہر حال دیکھ رہا ہے جو ہمارا حقیقی حاکم ہے اور اصل میں جس کا پاس اور لحاظ ہونا چاہیئے۔

وہ ایک اکیلا ہے یعنی کوئی اُس کے مقابل میں نہ نفع کا مالک ہے نہ ضرر کا لہذا ہمیں بس اُسی کی رضامندی کی فکر کرنا چاہیئے اور وہ رضامندی صرف نیک باتوں اور رفاہ عام کے کاموں سے حاصل ہوتی ہے اور اس کی ناراضگی سے اندیشہ کرنا چاہیئے اور وہ صرف بُری باتوں اور فساد و شرارت میں ہے اس لیے کسی باطل کے دباؤ کسی بُرائی کے محرک اور کسی غلط مشورہ دینے والے سے مرعوب و متاثر نہ ہوں

اللہ کی طاقت ہر ایک سے غالب ہے اس لئے اس کے مقابل کوئی رکاوٹ ہرگز قابل لحاظ نہیں ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے اس لیے کسی دشوار منزل کو اُس کے مقاصد کی راہ میں ناممکن نہ سمجھنا چاہیئے۔ وہ ہر کمزور کا آخری سہارا ہے، اس لئے اپنی کمزوری سے ناامید ہونا غلط ہے۔

اس عقیدہ سے ایک وسیع انسانی برادری کی تشکیل ہوتی ہے جس میں سے ہر فرد دوسرے کے ساتھ اخوت و مساوات کا احساس رکھتی ہو اور سب ایک نصب العین پر گامزن ہوں۔ سب اپنی خواہشوں کو

www.kitabmart.in

مقاصد کی راہ میں فنا کردیں اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بہرحال اُس کی رضا کے طالب رہیں اور کسی وقت قانون کے احترام کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اس جماعت کے افراد میں خودداری ہو کہ وہ کسی مادی طاقت کے سامنے سر نہ جھکائیں، بلند حوصلگی ہو کہ کسی دشوار مقصد کو ناممکن نہ سمجھیں اور اعتماد ہو کہ جس سے کبھی اپنے دل میں یاس کا گذر نہ ہونے دیں۔

لا الٰہ الا اللہ

اسلام کا کلمۂ توحید مذکورۂ بالا تمام اثرات کا اصل سرچشمہ ہے اس میں اللہ کے سوا ہر ایک کے معبود ہونے کی نفی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کے سوا نہ کسی دوسرے کو خالق و رازق اور اس کے بالمقابل کائنات کا انتظام کرنے والا مانتے ہیں اور نہ اُس کے مقابلہ میں اور اُس کے احکام کے برخلاف کسی دوسرے کے سامنے سر جھکانے کیلئے تیار ہیں۔ چاہے وہ پتھر، لوہے یا لکڑی وغیرہ کی مورتی ہو اور چاہے کوئی ظاہری جاہ و جبروت رکھنے والا گوشت پوست سے بنا ہوا انسان ہو۔

یہ وہی توحید کا عقیدہ ہے جو ایک مسلمان میں آزادیِ ضمیر کا محافظ ہے جو ہزار ظلم و تشدد کی زنجیروں میں بھی اُس کی حریت کو برقرار رکھتا ہے اور جس کی وجہ سے اس کا غلام بنانا دنیا کی طاقت سے باہر ہے مسلمانوں کی تمام علمی پستی، تباہی اور غلامی کا راز حقیقت توحید سے ان کے بیگانہ ہو جانے کا نتیجہ ہے۔

زبان پر کلمہ لا الٰہ الا اللہ جاری ہو جانے سے ظاہر ہو

www.kitabmart.in

پر تو اسلام حاصل ہو جاتا ہے مگر حقیقی اسلام و ایمان اسی وقت حاصل
ہو سکتا ہے کہ جب اس کلمۂ توحید کی حقیقت ذہن میں راسخ ہو۔
حضرت اقدس الٰہی ہمیں اور سب مسلمانوں کو عملی طور پر موحد ہونے
کی توفیق کرامت فرمائے۔

www.kitabmart.in

(۲) عدل

توحید خالق کے کمال ذات کے ماننے کا نام ہے اور عدل اُس کے کمال افعال کا۔

توحید جس طرح اسلام کا اصل اصول اور طرۂ امتیاز ہے جس سے وہ تمام مذاہب عالم میں خصوصی طور پر متعارف ہے اسی طرح عدل مسلمانوں کے فرقۂ امامیہ کے عقائد کا بنیادی اصول ہے جس سے تمام فرق اسلام میں اُن کا خصوصی تعارف ہوتا ہے۔

حسن و قبح عقلی

تمام کاموں میں بجائے خود اچھائی یا برائی پائی جاتی ہے۔ بہت سے ایسے کام ہیں جو بہر حال اچھے ہیں چاہے کرنے والا کوئی ہو۔ اور بہت سے کام بہرصورت بُرے ہیں چاہے ان کا کرنے والا کوئی بھی ہو۔

یہ اور بات ہے کہ کسی کام کی اچھائی یا بُرائی کو ہماری عقل سمجھ نہ سکے۔ یہ ہماری نادانی ہوگی لیکن اصل حقیقت کے اعتبار سے اس میں ایسے پہلو ضرور ہوں گے جنھیں ہماری عقل بھی اگر ترقی یافتہ ہوتی تو سمجھ لیتی

عادل ہونے کا مطلب

اللہ کو عادل کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہرگز ایسا کام نہیں کرتا

www.kitabmart.in

جس میں برائی پائی جاتی ہو یا بے فائدہ ہو بلکہ اُس کے سب کام اچھے اور فائدہ مند ہی ہوتے ہیں۔

یہ پابندی کسی دوسری طاقت کی طرف سے عائد کی ہوئی نہیں ہے جو اس کی قدرت کے خلاف ہو بلکہ یہ خود اُس کے کمال علم و قدرت کا تقاضا ہے جس کے خلاف اُس کے شایانِ شان نہیں ہے

عدالت کے معنی مساوات کے نہیں ہیں تاکہ کائنات میں جو تفرقہ آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے وہ عدالت کے خلاف قرار پائے بلکہ صلاحیتوں، ضرورتوں اور قیمتوں کے فرق کے ساتھ کام میں فرق ہونا عین تقاضائے عدالت ہے۔ عدل کا جو مطلب ہے کہ وہ جو کرتا ہے صحیح و مناسب ہی ہوتا ہے غلط، برا اور بے فائدہ کام اس سے سرزد نہیں ہوتا۔ اس معیار پر نظام عالم میں جو تفرقہ ہے وہ بھی عدل کے مطابق ہے۔ خالق کی طرف سے ذرہ بھر بھی ظلم کا امکان نہیں ہے۔

عدل کا ماننا کیوں ضروری ہے

فعل شر کا مرتکب وہی ہوگا جس کی ذات میں تقاضائے شر موجود ہو۔ ذات الٰہی سراسر خیر ہے تو پھر اُس کے افعال میں شر کا تصور کیا پھر یہ کہ برا کام جو کرتا ہے وہ یا اُس کی برائی سے ناواقفیت کی بنا پر یا جانتے ہوئے کسی غلط جذبہ سے مغلوب ہو کر۔

www.kitabmart.in

خالق کے یہاں علم اور قدرت دونوں کامل ہیں اس لئے نہ یہاں ناواقفیت کا امکان ہے نہ مغلوب ہونے کا پھر وہ کوئی برا کام کیوں کرنے لگا۔

عدل کے حدود کی وسعت

عدل کے اقرار کے ساتھ اللہ سے ظلم اور برائی کی جتنی صورتیں ہیں سب کی نفی ہو جاتی ہے۔ خدا کا اپنے بندوں کو برے کاموں پر مجبور کرنا اور پھر خود ہی اُن کو سزا دینا، بندوں کو اُن کی طاقت سے زیادہ احکام دینا، فرمانبردار بندوں کے ساتھ ناانصافی کر کے ان کو عمل سے کم بدلہ دینا، نافرمان بندوں کو اُن کے استحقاق سے زیادہ سزا دینا، بندوں پر بغیر قصور کے عذاب نازل کرنا، اپنے احکام کو پہونچائے بغیر اُن کی مخالفت پر بازپرس کرنا وغیرہ وغیرہ یہ تمام باتیں خالق کی شان کے خلاف ہیں جن کا تصور بھی اُس کے متعلق نہیں کرنا چاہیے۔

عدل کی بنیادی اہمیت

توحید، نبوت اور قیامت تو تمام مسلمانوں کے نزدیک دین کے لازمی اصول ہیں مگر عدل کو نہ مانا جائے تو رسولوں کی تصدیق کا نہ کوئی ذریعہ رہیگا اور نہ قیامت ماننے کا کوئی باعث۔ رسول کی ضرورت اسی لئے تو ہے کہ ہدایت خلق پروردگار کے لیئے لازم ہے۔ جب اگر خالق کے افعال میں کسی بات کی پابندی ضروری نہیں تو اس کی کیا ذمہ داری ہے کہ وہ اس ہدایت کے کام کو ضروری انجام

www.kitabmart.in

دے۔ اس کے علاوہ تصدیق رسولؐ معجزہ کے ذریعہ سے ہوتی ہے
اور وہ یوں کہ اگر یہ شخص اپنے دعوے میں سچا نہ ہوتا تو خالق اس کے
ہاتھ پر معجزہ ظاہر نہ کرتا بایں کہ وہ کسی کو اس کے مقابلہ کی قدرت عطا
کر دیتا۔ لیکن اگر یہ سمجھا گیا کہ قادر مطلق کے لئے ہر بات جائز ہے تو
اس کا کیا ثبوت رہے گا کہ جس کے ہاتھ پر اس نے معجزہ ظاہر کیا وہ سچا
ہی نبی ہے۔

اسی طرح قیامت کی بنیاد تو جزا و سزا کے ضروری ہونے پر ہے
اگر یہ مانا گیا کہ اللہ کے لئے عدالت ضروری نہیں تو جزا و سزا کس لئے
ہوگی۔ اگر صرف انبیاء کے خبر دینے کی وجہ سے اسے مانا جائے
تو یہ ابھی بتایا جا چکا کہ خود انبیاء کی سچائی ہی کا بغیر عدالت ثابت
ہونا ممکن نہیں بغیر ان کی خبروں کے بعد بھی اگر قیامت کوئی چیز
نہ ہو تو جھوٹ یا وعدہ خلافی کا الزام عائد ہوگا۔ لیکن اگر یہ سمجھا گیا کہ
خالق کے لئے کوئی برائی برائی ہی نہیں تو اس سب میں کیا ہرج ہوگا۔
غرض یہ کہ پورے مذہب اور شریعت کی عمارت اس اصل کے نہ
ہونے سے ایکدم گر جائے گی اور اسی سے اس کے اصول دین میں
ہونے کی وجہ ظاہر ہے۔ قرآن نے اسی لئے صاف کہا ہے :

تمت کلمۃ ربک صدقا وعدلا لا مبدل لکلماتہ

"تمھارے پروردگار کی بات سچائی اور عدالت کے ساتھ پوری ہے۔ کوئی چیز اس
باتوں کو بدل نہیں سکتی۔"

اور ۔ ان اللہ لیس بظلام للعبید ۔ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں

ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ

"اللہ کے یہاں ذرہ برابر ظلم نہیں"

امامیہ مشن کے رسالہ "اصول دین اور قرآن" میں اس بارے میں چالیس سے زائد آیتیں درج کی گئی ہیں جو اس کا قطعی ثبوت ہیں۔

جبر و اختیار

انسان کو اُس کے افعال میں بالکل مجبور جاننا یا یہ ماننا کہ اصل میں اس کے افعال کا فاعل وہ خود ہے ہی نہیں بلکہ اللہ ہے اور پھر بھی عدول حکمیوں کی سزا اس کو ملنا اور کفر و شرک پر دوزخ میں ڈالا جانا عدل الٰہی کے خلاف ہے اور اس لیے ماننے کے قابل نہیں ہے۔

اسی طرح یہ کہ وہ بالکل مختار ہے یعنی جو کرنا چاہیے وہ بہر صورت کرسکتا ہے کوئی اس کی راہ میں رکاوٹ حائل نہیں ہوسکتی۔ یہ خیال خالق کی قدرتِ کاملہ کے خلاف ہے اس لیے صحیح نظریہ ان دونوں سے ہٹ کر بین بین کار استہ ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے اچھے اور بُرے افعال کا فاعل مختار اور ان کا ذمہ دار ہے اور وہ جو کرنا چاہے کرتا ہے جب تک کہ خالق کی قدرت اُس کے سدِ راہ نہ ہو۔ لیکن جب خالق کی قدرت درمیان میں حائل ہو جائے تو پھر یہ انسان بے بس ہو جائے گا اور جو چاہے اسے نہ کر سکے گا اور اس صورت میں نتیجہ کی ذمہ داری بھی اس پر نہ ہوگی

امامیہ مشن سے دو رسالے "جبر و اختیار" کے موضوع پر نکل چکے ہیں

www.kitabmart.in

جن میں باوجود اختصار کے اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی پڑ گئی ہے وہ اس مسئلہ کے پورے طور پر سمجھنے کے لئے بہت حد تک کافی ہے

مظالم اور تکالیف و آلام

دنیا میں بہت سے اشخاص مظالم و مصائب اور تکالیف میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو "یزداں" کے مقابلہ میں کسی "اہرمن" کی پیداوار ہیں نہ گذشتہ جنم کے "پاپوں" کا کرشمہ اور نہ معاذ اللہ خود اللہ کے عدم عدالت کا ثبوت

بلکہ کبھی وہ عام نظام اسباب کے تحت میں خود انسانوں کے ارادہ و اختیار کا نتیجہ ہوتے ہیں اور کبھی خالق کی طرف سے اسی دور زندگی کے گذشتہ اعمال کی سزا کے طور پر اور جہاں یہ کچھ نہ ہو وہاں وہ مجموعی نظام عالم کے سلسلے کی کوئی کڑی ہیں جن کے تحت میں یہ انسان ضمنی طور پر آجاتا ہے اور اس صورت میں اس کی اس تکلیف کا معاوضہ اسے خالق کی طرف سے ایسا ضرور ملے گا جس کے مقابلہ میں یہ تکلیف ناقابل لحاظ قرار پا جائے۔

ابتلاء و مصیبت کے وقت اس معاوضہ کی پوری خبر اس شخص کو ہونا کوئی ضروری امر نہیں ہے۔

بے غرض اور باغرض

افعال الٰہی "بے غرض" نہیں ہوتے یعنی بے کار اور بے فائدہ

کام اُس کے شایانِ شان نہیں مگر یہ غرض خود اُس کی ذات سے متعلق نہیں ہوتی وہ بلاشبہ بے نیاز ذات ہے ۔ اُس کے افعال کا باعث خود اس فعل کا حُسن ذاتی ہوتا ہے یا اپنے مخلوقات کو فائدہ پہونچانا ہوتا ہے لہذا اپنی ذات کے لحاظ سے اُس کے کام یقیناً بالکل "بے غرض" ہوتے ہیں

احکام شرعیہ کے مصالح

نوع انسان پر تکالیف شرعیہ کی ذمہ داری عائد کرنا "خیر" کے سوا ہرگز کسی حیثیت سے بھی شر نہیں ۔

اسی سے نوعِ انسانی جوہر کمال جو اُس کا "حسن اختیار" ہے عالم ظہور میں آتا ہے ۔

یہ تصور کرنا کہ احکام اُنھی کے لئے ہوتے جو اطاعت کرنے والے ہیں اور نافرمانوں کے لئے احکام نہ ہوتے، غلط ہوگا اس لئے کہ فرماں برداری اور نافرمانی کی تفریق تو خود احکام کی ہمہ گیری کا نتیجہ ہے پھر وہ احکام میں تفریق کا سبب کیونکر ہو سکتی تھی ۔

اُس کے علاوہ اطاعت کرنے والوں کا امتیاز جو اُن تکالیف کے مستحسن ہونے کا راز ہے وہ اُن کے عام ہونے ہی سے وابستہ ہے ۔

ایسے ہی تمام ان چیزوں کا وجود جو انسان کے اس جوہر کمال کے ابھاگر ہونے کا ذریعہ ہیں جیسے جذبات اور ان کے مراکز ۔ خواہشیں اور ان کے پورے ہونے کے اسباب یہاں تک کہ شیطان اور اُس کے تمام نمائندے جیسے نمرود، فرعون اور یزید وغیرہ سب ہی کا وجود نظام

www.kitabmart.in

کائنات میں ضروری تھا کہ بغیر اُن کے وجود میں آئے ہوئے بہت سی انسانی رفعتیں جو کامل افرادِ بشر میں مضمر تھیں عالمِ ظہور میں آ ہی نہیں سکتی تھیں لہذا شیطان وغیرہ کے افعال کی برائی تو وہ اُن کی ذات سے متعلق ہے اور اُن اشخاص کا وجود میں لانا جو خالق کریم کا فعل ہے وہ بالکل خیر ہے جس میں شر کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے

اس کی تفصیل مسئلہ دعا میں ہے جو امامیہ مشن سے شائع ہوا ہے

عدل اور ظلم کے بارے میں کچھ تشریحات

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عدل ظلم کے مقابل میں ہے لہذا اس کا تقاضا ہے کہ حقوق کی مراعات میں کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو یعنی کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔

اس صورت میں یہ سوال کہ انسانی افراد میں عمروں کا فرق صحت و قوت میں فرق دل و دماغ میں فرق اور مال و اولاد میں فرق کیوں ہے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس لئے کہ یہ سب مخلوق ممکنات میں سے ہے اور ممکن ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اُس کی ذات میں خود کوئی تقاضا وجود کا نہیں ہے۔

اور جب وجود اپنا نہیں تو اور کیا شے اپنی ہو سکتی ہے کیونکہ اور جو کچھ اپنا ہو سکتا ہے وہ تو وجود ہی کی بدولت ہو سکتا ہے۔ یہ خالق کی فیاضی ہے کہ وہ وجود بخشتا ہے اور اس پورے نظام کائنات کی مصلحتوں کے مطابق جتنا جسکو مناسب ہے اتنا عطا کر دیتا ہے

بھی نہ کرے تو یہ اس پر کوئی ظلم نہیں ہے۔ اسی طرح کسی شے کو وجود میں لاکر جب فنا کر دے تو کوئی شکایت کا محل نہیں۔ اس بچہ نے کہ جو پیدا ہوتے ہی مرگیا یقیناً اپنے اتنے ہی وجود کے ساتھ اُن مقاصد کو پورا کر دیا ہے جو اس پورے نظام کائنات کی ایک کڑی ہونے کے اعتبار سے اس کی ذات کے ساتھ وابستہ تھا اور جس کے لئے اس کی خلقت ہوئی تھی مگر ہم اس پورے نظام کائنات کا احاطہ کہاں رکھتے ہیں جو اس کی تمام کڑیوں کے فوائد و مقاصد اور اُن کے باہمی ارتباط کو سمجھ سکیں۔

حال یہ اس صورت میں ہے کہ جب اس بچہ کے مرنے میں کسی انسانی مداخلت کا دخل نہ ہو کیونکہ اکثر اس طرح کے حوادث اور اسی طرح بہت سی تکلیفیں یا ذلتیں جو آدمیوں کو پہونچتی ہیں وہ اُن کے کرتوتوں کا نتیجہ ہوتی ہیں جن کی ذمہ داری خالق پر عائد نہیں ہوتی۔

ایسے ہی وہ مظالم جو انسانوں پر انسانوں ہی کے ہاتھ سے ہوتے ہیں کیونکہ اس نے انسان کو عدالت ہی کی بنا پر فاعل مختار بنایا ہے اس لئے اس کے افعال کا وہ ذمہ دار نہیں ہے۔ پھر بھی وہ اپنے نیک بندوں کو ان مصائب پر صبر کرنے سے ثواب عطا فرماتا ہے۔ یہ اس کا فضل و کرم ہے۔

رہ گیا یہ کہ اس نے کسی کو آدمی بنایا اور کسی کو جانور۔ کوئی درخت بنا اور کوئی پتھر تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ فرق جو ذات اور ذاتیات سے متعلق ہیں یہ الگ سے نہیں ہوا کرتے۔ خالق کا کام تو ہر طبع کی چیز کو مصالح کے تقاضوں کے مطابق پیدا کر دینا ہے اُسے آدمی کو بھی پیدا کرنا

www.kitabmart.in

ضروری تھا اور جانوروں کو بھی۔ درختوں کو بھی اور پتھروں کو بھی اور اسی طرح کل چھوٹی اور بڑی کائنات کو۔

ان میں سے جو چیز بھی پیدا نہیں ہوتی نظام کا ایک ضروری جزو کم ہو جاتا اس لئے وہ ظلم ہوتا۔

اس نظام کامل کی مطابقت ہی جو موافق مصلحت ہے، عین عدل ہے جس کے خلاف خالق سے ہونا صحیح نہیں۔

عہد و میثاق اور اقتضائے طینت

قرآن و حدیث میں خلقت سے پہلے عہد و پیمان لئے جانے اور انسانوں کی مختلف طرح کی طینتوں کا ذکر اتنی کثرت سے اور صراحت کے ساتھ ہے کہ ان میں سے کسی بات کا انکار ممکن نہیں ہے مگر ان میں سے کوئی چیز انسانی افعال پر اس طرح اثرانداز نہیں مانی جاسکتی کہ وہ اپنے افعال میں بے بس اور بے قابو قرار پا جائے جس کے بعد "نیک و بد" افعال کی ذمہ داری اس پر نہ رہے۔ یہ کسی طرح درست نہیں ہے۔

زندگی اور موت

تمام حوادث کائنات کی طرح حیات و موت بھی خالق کے ارادہ و قضاؤ تقدیر کے ماتحت ہے مگر جس طرح ہر چیز میں تقدیر کے ماتحت تدبیر بھی ہوتی ہے اور جب تک خالق کا ارادہ قطعی طور پر اس تدبیر کے خلاف کارفرما نہ ہوگا ہو وہ تدبیر کارگر ہوسکتی ہے

حیات اور موت کو بھی سمجھنا چاہیئے۔

ایسی صورت میں موجودہ زمانہ کی یہ خبریں کہ ڈاکٹر کسی مردہ کو جلا لینے میں کامیاب ہو گئے یعنی موت آچکنے کے بعد اُس موت کو انہوں نے رد کر دیا، کسی مذہبی اصول کے خلاف نہیں ہیں۔

ہاں ایک منزل دنیا کے تمام حوادث میں وہ آجاتی ہے جب خلائق کی تمام کوششیں بے اثر ہو جائیں۔ اسی طرح موت کا وہ ایک ہنگام بھی آنا لازم ہے جہاں تمام ڈاکٹر زندہ کرنے سے عاجز ہو جائیں وہ خدا کی اُس تقدیر کا ثبوت ہوگا جو کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی۔

عقیدہ عدل کا عملی نتیجہ

خالق کی عدالت وہ ہے جو خلائق سے بھی انصاف و عدالت اور حسن کردار کی طلبگار ہے۔

اس نے ہمیں ایک امانت دی ہے جس کا نام ہے "اختیار" ہمیں اس اختیار کو صحیح ہی کاموں میں صرف کرنا چاہیئے۔

یہی عقیدہ ہے اُس برادری میں جو وحدت خالق کے رشتہ سے قائم کی گئی ہے تبادلہ حقوق اور تعیین حدود کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں انہیں حدود سے قدم آگے بڑھانے کا نام ظلم ہوتا ہے اور ظلم کرنے والوں پر اللہ لعنت فرماتا ہے یعنی یہ اعلان کہ وہ اُس کی رحمت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے دور رہیں۔

www.kitabmart.in

عقیدۂ عدل کے ماتحت دنیا میں امیر و غریب، طاقتور اور کمزور وغیرہ کے سب تفرقے ظاہری اور عارضی مانے جاتے ہیں اس لئے امیر کو امارت پر گھمنڈ نہیں ہونا چاہیئے اور غریب کو غربت سے دل شکستہ نہیں ہونا چاہیئے۔

حسن کردار سب کے لئے نجات کی یکساں شرط ہے۔ گناہ اگر غریب کریگا تو سزا پائے گا اور امیر کرے گا تو سزا پائیگا۔ اسی طرح اچھے کام اگر امیر کرے گا تو انعام پائے گا اور غریب کرے گا تو انعام پائے گا اس طرح ہر شخص کو اپنے فرائض کا احساس پیدا ہونا چاہیے اور اپنے اعمال کی جانچ کرتے رہنا چاہیئے۔

ہر چیز میں حد سے بڑھنا اور حد سے پیچھے رہنا دونوں ظلم ہیں۔ انسانی اخلاق سب اعتدال کے نقطہ سے وابستہ ہیں اور اسی اعتدال کے قیام سے انسان عادل کہلاتا ہے۔ اللہ کے عادل ماننے والوں کو خود بھی اپنے اعمال میں عدل کی پیروی کرنا چاہیئے اور فرض شناس مسلمان وہی ہیں جو عدالت کی صفت سے ممتاز ہوں۔

(۳) نبوت

"نبوت" یعنی اللہ کی طرف سے خلق خدا کو ٹھیک راستہ بتانے کے لئے ایسے انسان مقرر کیئے جاتے رہے ہیں جنھیں نبی کہا جاتا ہے

ربوبیت اور عدالت کا مجموعی تقاضا

پر مبنی ہے جن کی تصدیق توحید اور عدل میں حد ثبوت تک پہونچ چکی ہے۔

اگر کائنات کا آغاز بے شعور ذرات مادہ سے ہوا ہوتا، اگر ان کا خالق شعور و احساس سے عاری ہوتا، اگر وہ ارادہ و اختیار کے ماتحت کاموں کے انجام دینے سے قاصر ہوتا یا وہ کائنات کو وجود میں لا کر اس سے بے تعلق ہو گیا ہوتا اس طرح کہ اس کے اچھے برے سے کوئی سروکار نہ رکھتا۔ اور پھر اگر انسان اپنے افعال میں مجبور ہوتا اور خالق خود اپنے قہری ارادہ سے اضطراری طور پر جو چاہتا اس سے کرا لیا کرتا تو ان سب صورتوں میں نبوت کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا مگر یہ توحید کی منزل میں طے ہو چکا کہ اس کائنات کا ایک ایسا خالق ہے جو علم و حکمت اور ارادہ و قدرت کا مالک ہے اور وہ کائنات کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو گیا ہے بلکہ وہ رب ہے رب؟ یعنی تربیت کرنے والا تربیت ہ کسی شے کو رفتہ رفتہ اس کے مناسب حد کمال تک پہونچانا۔

انسان کے علاوہ ہر شے اپنی منزل تک تخلیقی نظام کے ماتحت اللہ کے ارادہ سے پہنچتی ہے۔ اس کے لئے درمیان میں کسی سفیر اور پیغام رساں یا رہبر کی ضرورت نہیں ہے۔

انسان بھی اپنی زندگی کی فطری رفتار میں پیدائش، بچپنے، جوانی پیری اور موت کے مرحلوں کو اسی نظام کے ماتحت طے کرتا ہے۔ مگر اس کے نظریات و افکار اور اعمال جو اس کی انسانیت کا خاصہ امتیازی

www.kitabmart.in

ہیں۔ یہ بھی اگر جبری طور پر ارادۂ الٰہی کے ماتحت انجام پاتے تو نبی کی ضرورت نہ تھی۔ اللہ جس راستے پر چاہتا، اُس پر اپنی قدرت سے خود ہی چلا دیتا۔

لیکن یہ عدل میں ثابت ہو چکا کہ انسان اپنے افعال و اعمال میں خود مختار بنایا گیا ہے۔ اس کا کام ہے کہ یہ اپنے ارادہ و اختیار سے ٹھیک راستے پر چلے اور غلط راستے سے بچے۔ لہٰذا اللہ کی ربوبیت جو اس کی مناسب حد کمال تک پہنچنے کا سامان کرنے کی ذمہ دار ہے متقاضی ہے کہ وہ ایسا سامان کرے کہ انسان کے سامنے ٹھیک اور غلط راستے پیش ہو جائیں اس طرح کہ اس پر کوئی جبر عائد نہ ہو بلکہ یہ اپنے ارادہ سے خود ٹھیک راستے پر چلے تو اطاعت شعار قرار پائے اور غلط راستے پر چلے تو نافرمان قرار پائے۔

اس طرح اس کی انسانیت کا جوہر اپنے اخلاق و اعمال سے ترقی اور کمال کی منزل تک باختیار خود پہنچے جو اس کی انسانی بلندی کا تقاضا ہے۔

یہی دستورِ حیات جو انسان کو کمال کے نقطہ تک پہنچانے کے لئے خالق کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے "شریعت" کہلاتا ہے اور وہ برگزیدہ انسان جو اس شریعت پر عمل کرانے اور انسانوں کو صحیح راستہ بتانے کے لئے مقرر ہوتا ہے نبی کہلاتا ہے۔ ہدایت و اصلاح کے کام پر اس کے مامور کیے جانے کو "بعثت" کہتے ہیں اور اللہ اپنے احکام جس طریقہ سے اس نبی تک پہنچائے اس طریقہ کو "وحی" کہتے ہیں

عصمت

اللہ کی جانب سے خلق خدا کی ہدایت کے لئے جو ہستی مقرر کیجائے وہ ایسی ہی ہو سکتی ہے جس کی ذات سے بھولے چوکے کبھی طرح بھی گمراہی خلق کا اندیشہ نہو۔ جو اللہ کے علم میں ایسا کامل انسان ہو اسی کو معصوم کہتے ہیں۔

افضلیت

نبی چونکہ افراد انسانی کو کمال کی منزل تک پہنچانے کیلئے آتا ہے اس لئے اُسے اپنے ماتحت دائرہ کے تمام افراد سے تمام انسانی کمالات میں بڑھ کر ہونا چاہئے تاکہ دوسرے لوگوں کو اُس کی پیروی کا حکم دیا جانا ناانصافی قرار نہ پائے۔

ہر قوم میں رہنما

خالق کی ربوبیت محدود نہیں ہے اس لئے اُس کی رہنمائی سے کسی ملک اور قوم کو محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ یقیناً اس نے ہر ملک اور قوم کے لئے کسی نہ کسی کو رہنما ضرور قرار دیا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اقوام اور بعض ممالک کے متعلق ہمیں صحیح علم نہو کہ اُن کی سچی رہنمائی اللہ کی طرف سے کن اشخاص کے متعلق تھی یا اُس قوم نے اُس کی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھایا ہو یا اب وہ اس سے دور جا پڑی اور جو تعلیم اس کی طرف اب منسوب کی جاتی ہے وہ اُس کی اصلی تعلیم نہو بلکہ مسخ ہو کر رہ گئی ہو۔

www.kitabmart.in

انبیائے گذشتہ

سابق زمانہ کے پیغمبروں کے جو نام ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

آدمؑ۔ ادریسؑ۔ نوحؑ۔ ابراہیمؑ۔ لوطؑ۔ اسمٰعیلؑ۔ اسحاقؑ۔ یعقوبؑ۔ یوسفؑ۔ خضرؑ۔ موسیٰؑ۔ ہارونؑ۔ شعیبؑ۔ ایوبؑ۔ ہودؑ۔ صالحؑ۔ یونسؑ۔ داؤدؑ۔ سلیمانؑ۔ ذوالکفلؑ۔ یسعؑ۔ زکریاؑ۔ یحییٰؑ۔ عیسیٰؑ

ان کی نبوت پر ایمان لانا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ ان کے علاوہ باقی انبیاء کا نام بنام یقین نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں مجمل طور پر یہ ماننا ضروری ہے کہ جتنے رہبر اللہ کی طرف سے آئے سب سچے تھے۔

اولوالعزم

جو انبیاء علمی دستور حیات یعنی شریعت لے کر آئے انھیں انبیاء اولوالعزم کہتے ہیں۔ وہ گزشتہ انبیاء میں صرف چار تھے نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ ان کے پہلے زندگی کے ابتدائی قاعدے جناب آدمؑ کے وقت سے ان کی اولاد میں ضرور نافذ تھے مگر وہ زندگی کے تمام گوشوں کو شاید اس حد تک حاوی نہ تھے کہ انھیں "شریعت" کے نام سے موسوم کیا جاتا اور اسی لیے جناب آدمؑ اولوالعزم کی فہرست میں داخل نہیں ہوئے۔

کتب

ان انبیاءؑ میں تین کو کتابیں عطا ہوئیں ۱

موسیٰؑ کو توریت۔ داؤدؑ کو زبور اور عیسیٰؑ کو انجیل۔ باقی بعض انبیاءؑ کو بھی "صحیفے" عطا ہوئے مگر وہ اُس معیار پر نہ تھے جنھیں کتاب کے نام سے موسوم کیا جاتا۔

ممکن ہے توریت کے ساتھ بائبل میں جو بہت سے صحیفے درج ہیں۔ ان میں سے بعض یا سب اصلیت کے لحاظ سے ٹھیک ہوں مگر توریت۔ زبور۔ انجیل اور ان تمام صحف کے موجودہ نسخے جو بائبل کے نام سے دنیا میں رائج ہیں وہ اصل کتب و صحف نہیں جو اللہ کی طرف سے اُس کے پیغمبروںؑ پر نازل ہوئے تھے بلکہ یہ بعد کے ساختہ پرداختہ ہیں۔

معجزہ

ہر رسولؑ کے ساتھ اُس کی سچائی کا کوئی نشان ہونا چاہیے جس کو شکست دینے اور اُس کا جواب لانے سے دوسرے عاجز ہوں۔ اس نشان کو "معجزہ" کہتے ہیں۔

یہ ایسی چیز نہیں ہو سکتی جو عقلاً غیر ممکن ہو لیکن ایسی چیز ضرور ہوتی ہے جو عام انسانی طاقتوں سے بالاتر ہو۔ اسی وجہ سے خصوصی طور پر اللہ کی جانب سے مقرر ہونے کی دلیل قرار پاتی ہے۔

پہلے نبی

سب سے پہلے اللہ کی طرف سے جو نبی مقرر ہوئے وہ حضرت آدمؑ تھے جو نوعِ انسانی کی پہلی فرد اور اس تمام نسل کے مورثِ اعلیٰ ہوئے

www.kitabmart.in

آدم مثل تمام انبیاءؑ کے گناہوں سے بری تھے جب ہی خالق طرف سے نبوت کے منصب پہ فائز ہوئے۔

گیہوں کھانے سے جو اُن کو ممانعت ہوئی وہ کوئی قانونی حکم نہ تھا جس کی مخالفت کو "گناہ" سمجھا جا سکے بلکہ وہ ایک ناصحانہ ہدایت تھی جس کی مخالفت میں وقتی طور پر یہ نقصان تھا کہ اس کے بعد وہ اس باغ میں جس کا نام "جنت" تھا قیام نہیں رکھ سکتے تھے چنانچہ گیہوں کھانے سے انھیں یہ نقصان برداشت کرنا پڑا، حالانکہ اگر یہ نہ بھی ہوتا تب بھی بالآخر وہ بھیجے جاتے اسی زمین پر کیونکہ نسل انسانی کا آگے بڑھنا اُن کے ذریعہ سے اور زمین پر خلافت الٰہی کے منصب کا انتظام جو اُن کا مقصد خلقت تھا، بغیر اس کے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

عیسیٰؑ ابن مریم

عیسیٰؑ اللہ کے ایک سچے نبی اور اُن کی ماں مریمؑ ایک پاکباز مقدس خاتون تھیں۔ انھیں اللہ نے اپنی قدرت سے بغیر باپ کے پیدا کیا جس طرح آدمؑ کو ماں، باپ دونوں کے بغیر اُس نے پیدا کیا تھا۔

اس کی وجہ سے انھیں خدا یا خدا کا بیٹا کہنا غلط ہے کیونکہ پیدا ہونا خود مخلوق ہونے کی نشانی ہے لہذا وہ خود خدا نہیں ہو سکتے اور بچہ باپ کا ایک جزو ہوتا ہے اور اللہ واجب الوجود ہے اُس کا کوئی جزو نہیں ہو سکتا لہذا اُس کا بیٹا بھی کوئی نہیں ہو سکتا

آخری رسول ﷺ

سب کے آخر میں اللہ نے ہمارے رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا۔ آپ اپنے پہلے کے تمام انبیاء سے افضل و بہتر تھے اور آپ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا آپ کی رسالت ہمیشہ کے لئے قائم و برقرار ہے۔

آخری کتاب

اللہ کی طرف سے حضرت محمد مصطفےٰ پر آخری کتاب نازل ہوئی جو "قرآن مجید" ہے

اس میں وہ تمام حقیقتیں جو سابق کتب میں نازل کی گئی تھیں محفوظ ہیں اور اُن کے آگے بھی قیامت تک کی رہنمائی کے لئے جامع تعلیمات درج ہیں۔

شریعت محمدی ﷺ

سابق انبیاءؑ کی شریعتیں اکثر ایسے احکام پر بھی مشتمل تھیں جو کسی محدود عبوری دور کے لئے موزوں و مناسب تھے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ قانون عطا ہوا جو مختتم حیثیت سے نوع انسانی کی انفرادی اور اجتماعی صلاح و فلاح کے ذرائع پر مشتمل ہے اس لئے اس شریعت نے گزشتہ تمام شریعتوں کو منسوخ قرار دیدیا اور یہ دائمی ہے جس میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

دلائل نبوت

ہمارے رسول حضرت محمد مصطفےٰ ؐ جن کے والد عبداللہ دادا
عبدالمطلب، پردادا ہاشم بن عبد مناف آل ابراہیم ؑ سے
خلیل ؑ کے فرزند اسمٰعیل ؑ کی نسل سے تھے۔ آپ چالیس برس کی عمر میں
رسالت کے اظہار پر مامور ہوئے اور آپ کے دعوے کی سچائی کثیر التعداد
یقینی دلائل سے ہر صاحب ہوش و خرد کے سامنے نمایاں تھی اور ہے مثلاً
(۱) گزشتہ انبیاؑ کی پیشین گوئیاں جو باوجود تحریف و تبدیلی کے بائبل میں
ابتک نظر آتی ہیں اور حضرت کی بعثت کے وقت اور زیادہ نمایاں طور
پر موجود تھیں۔

(۲) حضرتؐ کی مقدس اور پاک سیرت جس کا چالیس برس تک مشاہدہ
ہو چکا تھا۔ جس میں خصوصیت کے ساتھ سچائی اور امانتداری کا جوہر اتنا
نمایاں تھا کہ مشرکین نے آپ کا لقب ہی صادق اور امین قرار دے
لیا تھا۔

(۳) وہ غیر معمولی شواہد جنھیں معجزات کہتے ہیں۔ حضرتؐ کے لئے
اس طرح معجزے بھی ظاہر ہوئے جیسے سابق پیغمبروں ؑ سے ظاہر ہوئے تھے
یعنی جن کا مشاہدہ سے تعلق تھا جن میں بہت نمایاں شق القمر (چاند کا دو
ٹکڑے ہونا) رجعت شمس (سورج کا پلٹنا) تھا اور ایک معجزہ آپ
کا جو ہر دور کے اشخاص کے لئے باقی ہے۔ "قرآن مجید" ہے
قرآن کس کس حیثیت سے معجزہ ہے اس کا بیان تفصیل سے ہماری
کتاب "مقدمۂ تفسیر قرآن" میں دیکھنا چاہئے۔

دین اسلام اور شریعت محمدیؐ

اسلام نام ہے اس دین حق کا جس کا اصل اصول توحید یعنی بلا شرکت غیرے خالق کی عبادت ہے

یہ دین ازل سے ایک ہی تھا - آدمؑ سے لیکر خاتمؐ تک تمام انبیاءؑ اسی کی تبلیغ کیلئے آئے لیکن آپؐ سے زیادہ واضح دلنشین اور موثر طور پر حضرت محمد مصطفےٰؐ نے پیش کیا - اس اعتبار سے آپکو "بانی اسلام" کہا جاتا ہے -

مگر شریعت اُس قانون کو کہتے ہیں جس کو عملی زندگی میں اصلاح و تکمیل نفوس اور تنظیم خلق کیلئے خالق کی طرف سے نافذ کیا گیا ہو اس کے احکام احوال اور حالات کے اعتبار سے مختلف ہو سکتے ہیں چنانچہ گزشتہ شریعتوں کے بہت سے احکام شریعت محمدیؐ میں منسوخ کر دیئے گئے . بے شک اس شریعت میں ایسے جامع اصول رکھ دیئے گئے ہیں کہ اب یہ منسوخ ہونے والی نہیں ہے -

نسخ

اللہ کی طرف سے قانون کے کسی جزء کے تبدیل کر دینے کو نسخ کہتے ہیں

یہ تبدیلی کسی ناواقفیت یا پشیمانی کا نتیجہ نہیں بلکہ حالات اور مصالح کی تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے -

شریعت اسلام کی اکملیت

شریعت اسلام کی ... احکام کا معتدل ہونا

ہے۔ اس میں نہ مادی ضرورتوں کو نظر انداز کیا گیا اور نہ روح کے تقاضوں کو، بلکہ مادیت کے ساتھ روحانیت کو سمو دیا گیا ہے اور دین کے ساتھ دنیا کے آباد رکھنے کی دعوت دی گئی ہے۔

رہنمایان اسلامؑ کی تعلیم یہ ہے کہ لیس منا من ترک الدین للدنیاہ ولا من ترک الدنیا للدینۃ (یعنی) ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے جو دین کو دنیا کی خاطر چھوڑ دے اور نہ اس کا جو دنیا کو دین کی خاطر تج دے۔

یہاں کا خاص اصول یہ ہے کہ الدنیا مزرعۃ الآخرۃ "دنیا آخرت کی کھیتی ہے" اور یہ کہ لا رھبانیۃ فی الاسلام "اسلام میں علائق دنیا کا ترک کر دینا نہیں ہے"

عبادت کا مفہوم

شریعت اسلام میں عبادت صرف کچھ رسوم کے ادا کرنے یا بلاوجہ اپنے نفس یا جسم کو تکلیف دینے کا نام نہیں ہے بلکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر کام جو خالق کی رضا کیلئے اس کے قانون کے ماتحت انجام دیا جائے عبادت ہے۔

اس میں خالق کی تعظیم و پرستش کے طریقوں کے ساتھ ساتھ جسمانی زندگی کے تقاضے جیسے کھانا، پینا، سونا، جاگنا اور منزلی زندگی کے تقاضے جیسے اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ، بیوی بچوں کے ساتھ محبت و شفقت کے مظاہرے اور سیاسی زندگی کے تقاضے جیسے افراد قوم

www.kitabmart.in

کی بہبودی کے سامان اور اُن کی اصلاح و ترقی میں کوشش وغیرہ سب ہی داخل ہیں ۔

کتاب باقی

قرآن اس معنی میں تو کتاب باقی ہے ہی کہ پہلے کی کتابوں میں جو شرعی احکام تھے وہ اب منسوخ ہو چکے ہیں یا زیادہ مکمل طور پر قرآن میں آگئے ہیں، اس لئے اُن کتابوں کے کتاب الٰہی ہونے پر ہمیں فقط ایمان لانا ہے مگر عمل کی دنیا میں قرآن ہی ہے جسے پیش نظر رکھنا ضروری ہے اس کے علاوہ قرآن اس اعتبار سے بھی "کتاب باقی" ہے کہ دوسری کسی آسمانی کتاب کا وجود اپنی اصلی شکل میں دنیا کی کسی قوم کے پاس اس وقت نہیں ہے (اس کی تشریح امامیہ مشن کے رسالہ تحریف قرآن کی حقیقت" میں بہ تفصیل مذکور ہے ۔)

صرف قرآن مجید وہ کتاب ہے جو اپنے اصلی الفاظ کے ساتھ اس وقت دنیا میں موجود ہے ۔یوں چاہے جتنے ترجمے قرآن مجید کے دنیا کی زبانوں میں ہو جائیں مگر ان میں سے کوئی ترجمہ بھی مسلمانوں کے نزدیک قرآن نہیں سمجھا جا سکتا ۔

قرآن جس کا نام ہے وہ وہی چیز ہے جو اپنے واحد، متواتر قطعی اور غیر تبدیل شدہ الفاظ کے ساتھ کروروں انسانوں کے ہاتھوں میں اور لاکھوں آدمیوں کے سینوں میں محفوظ ہے اور دنیا کے ہزاروں انقلابات کے بعد بھی جو انشاء اللہ یونہی محفوظ رہے گا ۔

بے شک اُس کی آیتوں کی ترتیب وہ نہیں ہے کہ جس ترتیب سے

www.kitabmart.in

وہ نازل ہوئی تھیں مگر یہ بھی قرآن کی ساخت کا ایک غیر فانی معجزہ ہے کہ ترتیب بدل جانے کے باوجود اُسکے اعجاز کی اصل روح قائم و برقرار ہے اور اُس کی آیتیں اپنی منفرد شخصیتوں کے ساتھ بھی معارف کے جواہرات اپنے دامن میں لیے ہوئے اور زندگی کے راستوں میں مشعلیں روشن کیے ہوئے ہیں۔

www.kitabmart.in

(۴) امامت

امامت ایک بلند خداوندی منصب ہے جس کے متعلق قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نبوت و رسالت کے منصبوں پر فائز ہونے کے بعد خصوصی امتحان اور اس میں پوری پوری کامیابی کے نتیجے میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو حاصل ہوا اور خلیل کی خواہش کے مطابق مشیت ربانی نے اُن کی اولاد میں اُس کے قیام کی ضمانت کی چنانچہ حضرت محمد مصطفٰےؐ پر نبوت و رسالت ختم بھی ہو گئی تو امامت و خلافت حقہ پیغمبرؐ کی صورت میں ان کی اولاد طاہرینؑ کے اندر قائم و برقرار ہے۔

خلافت

"خلافت" کے معنی قائم مقامی اور جانشینی کے ہیں لہذا پیغمبر خداؐ کے بعد جو اُن کا قائم مقام اور جانشین ہو لسے "خلیفۂ رسول" کے نام سے تعبیر کرنا صحیح ہے اور وہ درحقیقت ایسا ہی ہو گا جو خالق کی طرف سے "امامت" کے منصب کا حامل ہو اس لئے یہ "امامت" جو ہمارا موضوع کلام ہے رسول خدا حضرت محمد مصطفٰےؐ کی صحیح جانشینی ہے جو اسلامی فرقوں میں شیعہ اور غیر شیعہ دوسرے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کا مرکزی نقطہ ہے۔

خلیفہ کی شان

"قائم مقام" اور "جانشین" اس کو کہتے ہیں جو اُن کاموں کو انجام دے جو اُس کے پیش رو کے ذمہ تھے۔ اس لئے خلیفہ کی شان کو سمجھنے

کے لیے اُس شخص کی شان سمجھنا ضروری ہے جس کا اسے خلیفہ ہونا ہے۔ پیغمبر کی حیثیت اگر ایک بادشاہ اور دنیوی حاکم کی ہوتی تو دنیوی بادشاہ اُن کی خلافت کے حامل سمجھے جا سکتے تھے مگر رسولؐ کی حیثیت تو ایک روحانی تاجدار اور دینی حاکم کی تھی جن کے احکام خود اُن کے احکام نہیں تھے بلکہ وہ اللہ کے احکام تھے جو اُن کی زبان سے پہونچتے تھے۔ اسی لیے انھیں ایسا ماننا ضروری ہے کہ اُن کے احکام میں ہوا و ہوس کا گزر نہیں اور ان کی باتیں اپنی ذاتی خواہش اور جذبات کے ماتحت نہیں بلکہ احکام الٰہیہ کے ماتحت ہوتی تھیں۔ اس صورت میں اُن کا جانشین بھی ایسا ہی ہو سکتا ہے جو خداوندی منشا کے مطابق خلق خدا کی اصلاح و تنظیم کا ذمہ دار ہو اور جس کے احکام سیاسی خود غرضیوں اور رملوکانہ مطلب برآریوں کے ماتحت نہیں بلکہ فرائض الٰہیہ کے احساس کے ساتھ ہوا و ہوس اور جذبات نفس کی کارفرمائی سے بالاتر ہوں ایسے ہی شخص کو "معصوم" کہتے ہیں۔

طریقہ انتخاب

یہ بالکل عقل میں آنے والی بات ہے کہ کسی منصب کے اصل عہدہ دار کا تقرر جس کے ہاتھ میں ہو اسی کے ہاتھ میں اُس کے جانشین اور قائم مقام کا بھی تقرر رہو۔

بندگان خدا کا اپنی کثرت آراء یا اجماع و اتفاق سے انتخاب کا حق جسے جمہوریت کا تقاضا سمجھا جاتا ہے مذہبی حکومت کے باب میں اگر صحیح مانا

گیا ہوتا تو رسول کے انتخاب کا حق امت کو ہوتا۔ حالانکہ مسلمانوں میں کوئی بھی جماعت اس کی قائل نہیں ہے۔ رسول کا انتخاب صرف اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اسی صورت سے خلیفہ رسول کا انتخاب بھی امت کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اللہ ہی کی طرف سے صحیح ہوگا جس کی تبلیغ خلق تک خود رسول خداؐ کی زبان سے ہوگی۔

خلیفہ کی موجودگی کا مقصد خلق کی اصلاح ہے۔ اگر اس کے تقرر کا اختیار ان کے ہاتھ میں ہوا تو وہ ایسے ہی کو منتخب کریں گے جو زیادہ سے زیادہ اُن کی خواہشوں کے مطابق ہو۔ اس سے اصلاح کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

پیغمبر اسلامؐ کے اعلانات

بعثت کے بعد جب حکم آیا کہ "اپنے قرابتداروں کو پیغام ہدایت پہنچائیے"۔ رسولؐ نے اس حکم کی تعمیل میں بنی ہاشم کو جمع کیا اور اپنی رسالت کا اعلان فرمایا تو اس وقت ارشاد کیا کہ "تم میں سے کون ہے جو اس وقت میری نصرت کا اقرار کرے۔ وہی میرا وزیر، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہوگا"۔ خدا اور رسولؐ کے علم میں سوا علیؑ کے کوئی نہ تھا جو اقرار نصرت اس وقت کرے چنانچہ سب خاموش رہے اور حضرت علیؑ تھے جنہوں نے نصرت کا وعدہ کیا اور رسولؐ نے علیؑ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے فرمایا کہ "بس یہ میرا وزیر، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہوگا"۔

صاف بات ہے کہ اگر خلیفہ کا انتخاب کا حق جمہور خلائق سے ہوتا تو رسول خداؐ اس وقت اس معاہدہ اور اس اعلان کا موقع ہی نہ تھا

www.kitabmart.in

خود آپ کا اس بارے میں اعلان کرنا اس کا ثبوت ہے کہ جسطرح آپ کی رسالت اللہ کی طرف سے ہے اسی طرح آپ کے خلیفہ کا تقرر بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کا اعلان رسول کے فرائض منصبی میں سے ہے۔ پھر وقتاً فوقتاً مختلف الفاظ میں آپ اس کا اظہار فرماتے رہے اور پھر آخر میں جب زندگی کا آخری حج بجالائے تو مقام غدیر خم میں خالق کے حکم تاکیدی کی تعمیل میں مسلمانوں کے مجمع عام میں ایک طویل خطبہ ارشاد فرمایا جس میں تبلیغ اسلام اور مسلمانوں کی ہدایت و اصلاح میں اپنے خدمات کو بیان کرنے کے ساتھ مسلمانوں کو اپنی وفات کے قریب ہونے سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے اقرار لیا کہ کیا میرا اختیار تم پر خود تم سے زیادہ نہیں ہے؟ اس اقرار لینے کا مطلب یہ ہوا کہ میرے مقابلہ میں تمھارا حق خود اختیاری کوئی چیز نہیں ہے۔ سب مسلمانوں نے اقرار کیا کہ بے شک ایسا ہی ہے۔ جب یہ اقرار لیا جا چکا تو آپ نے حضرت علیؑ ابن ابیطالب کو مسلمانوں کی نظروں کے سامنے اونچا کیا اور فرمایا کہ "جس کا میں حاکم ہوں اس کے یہ علیؑ حاکم ہوں گے" اس اعلان کے بعد بہت سے لوگوں نے علی ابن ابیطالبؑ کو مبارکباد دی اور بحکم رسولؐ "امیر المومنینؑ" کہہ کر سلام کیا یہ سب مراحل پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی وفات سے تقریباً ڈھائی مہینے پہلے طے فرما دیئے اور اس اعلان کے بعد رسولؐ مدینہ تشریف لائے، کچھ دن کے بعد علیل ہو گئے۔ وہ بیماری جس میں دنیا سے رحلت فرمائی مذکورہ اعلانات کے ساتھ ساتھ جن کے ذریعہ سے آپ نے اپنے پہلے جانشین کا اعلان فرما دیا دوسری حدیثوں میں آپ نے یہ بھی بتا دیا کہ میرے بعد

www.kitabmart.in

میرے بارہ خلیفہ ہوں گے۔ ان بارہ کے نام بعض مخصوص صحابہ سے خود آپ نے بھی بتائے اور ان میں سے ہر ایک امام بھی اپنے بعد کے امام کا نام صراحت کے ساتھ بتاتا رہا۔ اس طرح رسولؐ کے بعد اس الٰہی حکومت کے حکمراں معین ہوتے رہے جس کا سنگ بنیاد پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ سے رکھا گیا تھا۔

دُنیوی خلفاء

حضرت رسولخداؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے سیاسی رجحانات کی رو میں حکومت الٰہیہ کے نظام کے برخلاف بطور خود اپنے حکمران منتخب کیے۔ چونکہ یہ کاروائی آئین اسلام کے خلاف تھی اس لئے پیغمبرؐ کے اہل بیتؑ اور متعدد وفادار صحابہ نے ان خلفاء کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا اور حقیقی اسلام کے پیروؤں نے آج تک اُن حکومتوں کو تسلیم نہیں کیا ہے۔

بارہ امام

ذیل میں رسولؐ کے سچے خلفاء کے اسماء مع مختصر حالات کے ترتیب کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔

پہلے امام

نام ونسب: علی (علیہ السّلام) نام۔ والد ابوطالبؑ اور والدہ فاطمہ بنت اسد تھیں۔ ابوطالب کے والد عبدالمطلب تھے جو رسول اللہؐ کے دادا ہیں اس طرح حضرت علیؑ رسول اللہؐ کے سگے چچا کے بیٹے تھے۔

ولادت: آپ ۳۰ عام الفیل یعنی رسول اللہؐ کی پیدائش سے تیس برس بعد اور ہجرت سے ۲۳ برس پہلے خانہ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے۔ یہ خصوصیت

وہ بھی جو آپ کے سوا کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوئی۔

تربیت | حضرت علیؑ بچپن سے رسول اللہؐ کے ساتھ رہے۔ اس لئے کہ آپ کے والد ابو طالبؑ ہی رسول اللہؐ کے کفیل تھے اور سات برس کی عمر سے تو رسول نے اپنے چچا سے مانگ کر اس فرزند کو بالکل اپنی پرورش میں لے لیا اس کے بعد جوانی کی آخری منزل تک اور پیغمبر خداؐ کے آخری نفس بلکہ قبر میں سپرد کرنے تک آپ رسولؐ کے ساتھ رہے۔

اشاعت اسلام | جب حضرت رسولؐ کے پاس اللہ کا پہلا پیغام پہنچا تو حضرت خدیجہؑ کے علاوہ سب سے پہلے حضرت علیؑ نے آپ کی تصدیق کی قرابتداروں کو دعوت نصرت دیئے جانے کے موقع پر تنہا آپ تھے جنھوں نے نصرت وامداد کا وعدہ کیا۔ جب رسول اللہؐ نے ہجرت فرمائی تو حکم خدا سے علی ابن ابیطالبؑ کو اپنی جگہ پر چھوڑا۔ علیؑ کھنچی ہوئی تلواروں کے اندر رات بھر رسول کے بستر پر اطمینان کے ساتھ آرام کرتے رہے۔ مدینہ میں آکر جب مشرکین وکفار سے جہاد کا سلسلہ شروع ہوا تو بڑی بڑی خطرناک لڑائیوں میں علیؑ کی تلوار نے دشمنوں کو شکست دی۔

اشاعت اسلام میں شروع سے آخر تک علیؑ رسول اللہؐ کے دست و بازو بنے رہے اور بزم و رزم دونوں موقعوں پر اہم خدمتیں انجام دیتے رہے۔

اوصاف وکمالات | علم میں حضرت علی بن ابیطالبؑ کا وہ درجہ تھا کہ تمام صحابہ سر تسلیم خم کرتے تھے اور شرعی مسائل میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اخلاق و کردار کی بلندی کے دوست اور دشمن سب قائل تھے۔

حضرت رسولؐ نے ہمیشہ آپ کے فضائل مسلمانوں کے سامنے بیان کیے

اور طرح طرح سے یہ ظاہر کیا کہ ان کا مثل کوئی دوسرا نہیں ہے۔

مظالم پر صبر پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد ایک بڑی سازش کے ماتحت حضرت علی ابن ابیطالبؑ کی خلافت کو عام مسلمانوں نے تسلیم نہیں کیا اور آپ سے حکومت کے منصب کو چھین لیا گیا جس پر آپ نے مفاد اسلامی کے خاطر صبر کیا پھر بھی رسول اللہؐ کی خلافت کی حقیقی ذمہ داریاں آپ ہی سے متعلق تھیں اور آپ مختلف صورتوں سے انھیں پورا کرتے تھے۔ پچیس برس اس خاموشی کے ساتھ آپ نے دین حق کی خدمت انجام دی۔

خلافت ظاہری ۳۵ھ میں جمہور مسلمین نے خلافت کا عہدہ آپ کے سامنے پیش کیا۔ آپ اس عنوان سے اس عہدہ کے قبول کرنے سے انکار فرما رہے تھے مگر مسلمانوں کے اس عہد کے بعد کہ جس صورت سے آپ حکم دیں گے ہم اس طریقہ پر عمل کریں گے آپ نے اس منصب کو قبول کیا۔ لیکن معاندین نے آپ کو چین سے زندگی نہ گذارنے دی۔ جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیاں ہوئیں اور آپکو سخت روحانی تکلیف برداشت کرنا پڑی۔ پھر بھی آپ نے اس مختصر دور حکومت میں مسلمانوں میں اسلامی مساوات، سادگی اور عدالت وانصاف کا سچا نمونہ پیش کیا اور عہد رسولؐ کی یاد تازہ کردی۔

وفات افسوس کہ صرف پانچ برس حکومت کرنے کے بعد ۱۹ رماہ رمضان ۴۰ھ کو عبد الرحمن بن ملجم مرادی ایک خارجی نے مسجد کوفہ میں آپ کے سر مبارک پر تلوار لگائی دو روز اسی زخم کی تکلیف میں بسر کرکے ۲۱ رماہ رمضان کو ۶۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔

نجف اشرف میں آپ کا روضہ زیارت گاہ خلائق ہے۔

دوسرے امامؑ

نام و نسب حسن (علیہ السلام) نام۔ امیر المومنین حضرت علیؑ باپ، سیدۂ عالم فاطمہ زہراؑ ماں اور رسول اللہؐ نانا تھے۔

ولادت و تربیت ۱۵ رمضان ۳ھ مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔ بچپن میں سات برس اپنے نانا رسول اللہؐ کی آغوش رحمت میں پرورش پائی۔ حضرت کی وفات کے بعد اپنے باپ حضرت علی مرتضیٰؑ کی تربیت میں رہے۔

امامت و خلافت ۴۰ھ میں جب حضرت علیؑ نے شہادت پائی تو حضرت امام حسنؑ امام خلق ہوئے اور جمہور مسلمین نے بھی آپ کو خلیفہ تسلیم کیا۔ مگر امیر شام معاویہ نے آپ سے جنگ کرنے کیلئے فوج کشی کی۔ حالات ایسے تھے کہ شدید خوں ریزی کے باوجود فتنہ فرو ہونے کی کوئی امید نہ تھی لہذا آپ نے اُن شرائط پر جو دینی مقاصد کیلئے ضروری تھے، معاویہ کے ساتھ صلح کرلی اور ظاہری حکومت سے دست کشی اختیار کرلی مگر منجانب اللہ امامت جو آپ کو حاصل تھی وہ قابل انتقال چیز نہ تھی آپ خاموشی سے حدود امکان کے اندر اُس کے فرائض کو انجام دیتے رہے۔

صلح اور اس کا انجام مصالحت کے شرائط میں آپ نے پہلی شرط یہ رکھی تھی کہ امیر شام کو کتاب اور سنت کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔ اس اقرار کے ہوتے ہوئے کے بعد آپ کی صلح ایک فاتحانہ شان رکھتی تھی جس پر کسی کو معترض ہونے کا حق نہیں ہے اور آپ کا یہ فعل حکم خدا کے مطابق اور محل و موقع کے لحاظ سے بالکل مناسب تھا مگر امیر شام نے اس صلح کی کسی شرط پر بھی عمل نہیں کیا۔

سیرت زندگی حضرتؑ کے کردار میں حلم، بردباری، ضبط و تحمل اور سخاوت

وایثار کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ اس کے علاوہ تمام صفات کمال میں اپنے بزرگوں کے آئینہ بردار تھے۔

وفات دس برس آپ نے گوشہ نشینی میں گزارے۔ افسوس آپ کی یہ خاموش زندگی بھی دشمنوں کو گوارہ نہ ہوئی اور آپ کو زہر دیا گیا جس سے ۲۸ صفر ۵۰ھ کو ۴۷ برس کی عمر میں آپ نے وفات پائی۔ مدینہ منورہ میں جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

تیسرے امامؑ

نام ونسب حسین (علیہ السلام) نام۔ حضرت علی ابن ابیطالبؑ باپ سیدہ عالمؑ ماں رسول اللہؐ نانا اور حضرت امام حسنؑ آپ کے بڑے بھائی تھے۔

ولادت وتربیت ۳ شعبان ۴ھ مدینہ میں پیدا ہوئے اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ چھ برس رسول اللہؐ کی آغوش میں تربیت پائی۔ اس کے بعد حضرت علی ابن ابیطالبؑ کے زیر سایہ جوانی کی منزلیں طے کیں اور باپ کے بعد دس برس تک بڑے بھائی کے دست وبازو بنے رہے۔

امامت ۵۰ھ میں حضرت امام حسنؑ کی وفات کے بعد آپ امام خلق ہوئے چونکہ حضرت امام حسنؑ صلح فرما کر ایک مسلک مقرر کر چکے تھے جو مرضی الٰہی کے مطابق تھا اس لئے دس برس تک آپ اپنے بھائی کی طرح خاموشی کے ساتھ زندگی گزارتے رہے اور بد سے بدتر ہوتے ہوئے حالات کا مشاہدہ فرماتے رہے۔

یزید کی خلافت اور طلب بیعت حاکم شام معاویہ سے یہ بہت اہم شرط قرار پائی تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کو خلیفہ مقرر کرنے کا حق نہ ہوگا معاویہ نے سب شرطوں کے ساتھ آخر میں اس شرط کی

www.kitabmart.in

بھی مخالفت کی اور اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے یزید کی خلافت کا اعلان کر دیا
یہ یزید بڑا بدکردار آدمی تھا کھلم کھلا شراب پیتا تھا۔ نماز کو ترک کرتا تھا اور
بہت سے شرمناک کاموں کا ارتکاب کرتا تھا۔ امام حسینؑ نے انکار کر دیا
کہ میں اس کی بیعت نہیں کروں گا۔ معاویہ نے اس معاملہ میں آپ کے ساتھ
زیادہ سختی نہیں کی مگر ۶۰ھ میں معاویہ کا انتقال ہوگیا۔ یزید کو کدہوگئی کہ
کسی طرح حضرت امام حسینؑ سے بیعت لیجائے۔

واقعۂ کربلا اور حضرت کی شہادت

یزید نے مدینہ کے حاکم کو خط لکھا کہ حسینؑ سے بیعت لی
جائے نہیں تو ان کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیجا جائے۔
امام حسینؑ کو بیعت کسی طرح منظور نہ تھی مگر اپنی جان کی حفاظت کی کوشش
بھی ضروری تھی۔ آپنے مدینہ کو چھوڑ کر مکہ معظمہ میں پناہ لی مگر حضرت کو یہاں
بھی پناہ نہ ملی۔ کچھ لوگ حاجیوں کے لباس میں بھیجے گئے کہ وہ آپ کو
جس طرح ممکن ہو گرفتار کریں یا قتل کر ڈالیں۔ کوفہ کے لوگوں کے خطوط
آپ کے پاس بہت سے آئے ہوئے تھے کہ آپ یہاں تشریف لائیے اور
ہماری ہدایت کیجئے۔ آپنے اپنے چچازاد بھائی جناب مسلم بن عقیل کو وہاں
کے حالات دیکھنے کے لئے بھیجا بھی تھا۔ اب آپ بھی کوفہ کی طرف روانہ ہوئے
مگر اتنے عرصہ میں وہاں ابن زیاد کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور ہوا پلٹ
گئی تھی۔ آپ کے سفیر حضرت مسلم بن عقیل شہید کئے گئے جس کی اطلاع
آپ کو راستے میں دی گئی۔ ابن زیاد کی فوج حر بن یزید ریاحی کی قیادت
میں آپ کی مزاحمت کے لئے پہنچ گئی اور آپ کو گھیر کر کربلا کی زمین پر
پہنچا یا۔

دوسری محرم کو آپ زمین کربلا پر پہنچ گئے۔ تیسری محرم سے کوفہ سے لشکر آنے لگا۔ جس کی تعداد چند دن میں کم از کم تیس ہزار تک پہنچ گئی۔ عمر ابن سعد اس فوج کا افسر تھا۔ ساتویں سے پانی بند کر دیا گیا اور دسویں محرم ۶۱ھ کو آپ اپنے بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں اور تمام ساتھیوں کے ساتھ دوپہر کی جنگ کے بعد شہید ہوئے۔ سر آپ کا نوک نیزہ پر بلند کیا گیا خیموں میں آگ لگا دی گئی اور آپ کے اہل حرم قید کیے گئے۔ دشمنوں نے آپ کی لاش کو بغیر دفن چھوڑ دیا۔ تیسرے روز بنی اسد کے اہتمام سے دفن کی نوبت آئی۔ کربلائے معلیٰ میں آپ کا روضہ مطہر مرجع خلائق ہے۔

چوتھے امام

زین العابدین علی بن الحسین (علیہ السلام) آپ حضرت امام حسینؑ کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ والدہ آپ کی جناب شہربانو شہنشاہ ایران کی بیٹی تھیں۔ ۱۵ جمادی الثانیہ ۳۸ھ میں ولادت ہوئی۔ صرف ۲ سال کی عمر تھی جب آپ کے جد بزرگوار امیر المومنینؑ کی وفات ہو گئی آپ نے اپنے چچا حضرت امام حسنؑ اور والد حضرت امام حسینؑ کے زیر سایہ تربیت پائی۔
۶۱ھ میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے موقع پر آپ اس قدر بیمار تھے کہ نشست و برخاست مشکل تھی۔ اس لئے جہاد کرنے کا حکم آپ کو نہ تھا۔ آپ بستر بیماری پر غش کے عالم میں رہے اور گھر کے مرد سب شہید ہو گئے شہادت حسینؑ کے بعد آپ اہل حرمؑ کے ساتھ قید ہوئے اور شہر بہ شہر پھرائے جانے کے بعد قید خانہ شام سے رہا ہو کر مدینہ گئے جہاں آخر عمر تک قیام فرمایا اس کے بعد زندگی بھر سوا باپ پر گریہ اور عبادت الٰہی کے کوئی شغل

نہ تھا۔

عبادت آپ کی مشہور ہے۔ نمازوں کی کثرت ہی سے "سید الساجدینؑ"
لقب ہو گیا اس کے ساتھ احکام شریعت اور علوم اہلبیتؑ کی خاموشی کے
ساتھ تعلیم بھی دیتے رہے۔

۲۵ محرم ۹۵ھ کو ۵۷ برس کی عمر میں ولید بن عبدالملک کے
دلوائے ہوئے زہر سے شہادت پائی اور اپنے چچا حضرت امام حسنؑ کے پاس
جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

پانچویں امامؑ

امام محمد باقر علیہ السلام امام زین العابدینؑ کے فرزند تھے۔ آپ
کی والدہ امام حسنؑ کی صاحبزادی تھیں جن کا نام فاطمہ تھا۔ یکم رجب ۵۷ھ
کو پیدا ہوئے۔ ساڑھے تین برس کی عمر میں واقعہ کربلا میں شریک ہوئے اور
اہلحرمؑ کے ساتھ قید کی تکلیفیں برداشت کیں۔ اس کے بعد اپنے والد بزرگوار
کے سایہ میں پروان چڑھے۔

آپ کو علوم اہلبیتؑ اور شریعت اسلام کی اشاعت کا بہت موقع
ملا اور آپ سے بہت کثرت کے ساتھ لوگوں نے استفادہ کیا۔ آپ کے
ایک شاگرد جابر بن یزید جعفی نے ستر ہزار حدیثیں آپ سے یاد کیں اور
اسی طرح ابان ابن تغلب۔ ابو حمزہ ثمالی۔ زرارہ بن اعین۔ محمد بن مسلم۔ ابوبصیر
وغیرہ بڑے پایہ کے علما تھے جو آپ کے حلقۂ درس میں کمال کے درجہ تک
پہنچے۔

۷ ذی الحجہ ۱۱۴ھ کو ستاون برس کے سن میں ہشام بن عبدالملک

کی طرف سے زہر سے آپ کی شہادت ہوئی۔ جنت البقیع میں اپنے والد کے پاس دفن ہوئے۔

چھٹے امامؑ

جعفر صادقؑ (علیہ السلام) امام محمد باقرؑ کے فرزند تھے۔ ۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ کو پیدا ہوئے اپنے والد بزرگوار کے بعد علوم اہلبیتؑ کے دریا بہائے آپ کے شاگردوں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ تھی۔ ممالک اسلامی کے دور دور سے علم حاصل کرنے آپ کے پاس آتے تھے جن میں دوست دشمن کی تفریق نہ تھی۔

۱۵ شوال ۱۴۸ھ میں ۶۵ برس کی عمر میں منصور دوانقی کی طرف کے زہر سے شہید ہوئے اور جنت البقیع میں اپنے بزرگوں کے پاس دفن ہوئے۔

ساتویں امامؑ

موسیٰ کاظم (علیہ السلام) امام جعفر صادقؑ کے فرزند تھے ۷ صفر ۱۲۸ھ کو پیدا ہوئے اور اپنے والد کے بعد فرائض امامت کے ذمہ دار ہوئے۔

عبادت، علم اور سخاوت ہر صفت میں اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر اور اپنے زمانہ میں سب سے بہتر تھے۔ تعلیم شریعت میں برابر مصروف رہے۔

ہارون رشید نے آپ کو قید کیا اور زندگی کے آخری چند سال برابر قید تنہائی میں بسر ہوئے۔ آخر قید خانے ہی میں پچپن ۵۵ برس کی عمر میں ۲۵ رجب ۱۸۳ھ کو ہارون رشید کے زہر سے شہادت پائی اور بغداد کے نزدیک اُس مقام پر جو آپ ہی کے نام پر "کاظمین" کہلاتا ہے دفن ہوئے

آٹھویں امامؑ

علی رضا (علیہ السّلام) امام موسیٰ کاظمؑ کے فرزند تھے۔ ۱۱ر ذی القعدہ سنہ ۱۴۸ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد بزرگوار کے بعد امام خلق ہوئے۔ آپ کے علم و تقویٰ اور عبادت اور نیز تمام صفات کمال کی وجہ سے تمام مسلمان آپ کی عزت کرتے تھے۔

مامون رشید بادشاہ کو آپ کے اس بڑھتے ہوئے اقتدار سے اندیشہ ہوا اور اُس نے بخیال خود آپ کو قابو میں لانے کیلئے ولی عہدی پر مجبور کیا۔ آپ بہت انکار فرماتے رہے مگر مامون نے تشدد کا طریقہ اختیار کیا۔ مجبوراً آپ نے منظور فرمایا۔ مگر مامون کا خیال غلط ثابت ہوا ولی عہد ہونے کے بعد بھی آپ نے اپنے خاندان کی سادہ زندگی اور اصلی احکام شریعت اور مذہب حق کی تبلیغ کو ترک نہیں کیا اس بنا پر مامون کو پھر آپ کا وجود ناگوار ہوا اور آخر آپ کو زہر دیا جس سے ۱۷ر صفر سنہ ۲۰۳ھ کو آپ کی شہادت ہوئی۔

نویں امام

محمد تقی (علیہ السّلام) امام رضاؑ کے فرزند تھے۔ ۱۰ر رجب سنہ ۱۹۵ھ کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے وقت آٹھواں برس تھا مگر تعلیم ربانی کا اثر تھا کہ اسی زمانہ میں آپ کے علم و کمال و عظمت کا سکہ دل پر بیٹھ گیا۔ اسی عمر میں بغداد کے بڑے بڑے علماء سے مناظرہ کیا اور مامون نے اپنی بیٹی ام الفضل کا عقد آپ کے ساتھ کر دیا۔ یہ تدبیر اس لئے کی گئی تھی کہ شاید اس طرح امام محمد تقیؑ ... صحیح اسلام

کی تبلیغ میں کمی کر دیں مگر یہ ذریعہ بھی ناکام ثابت ہوا۔ آخر معتصم باللہ عباسی کی طرف سے آپ کو بھی زہر دیا گیا۔ اور صرف ۲۵ برس کی عمر میں ۲۹ ذی القعدہ کو ۲۲۰ھ کو شہادت پائی

دسویں امامؑ

علی نقیؑ (علیہ السلام) امام محمد تقیؑ کے فرزند تھے۔ ۵ رجب ۲۱۴ھ کو متولد ہوئے اور اپنے والد کے بعد امام خلق ہوئے اور سچے مسلمانوں کو جو اس گھرانے سے وابستہ تھے شریعت اور احکام دین کی تعلیم دینے میں مصروف ہو گئے۔

آخر متوکل عباسی نے آپ کو مدینہ میں رہنے نہ دیا اور ۲۴۳ھ میں اپنے پایہ تخت سامرا میں بلا کر نظر بند کر دیا۔ گیارہ برس آپ نے نظر بندی کے عالم میں بسر کیے اور ۳ رجب ۲۵۴ھ کو چالیس برس کی عمر میں معتز باللہ کے زہر سے شہادت پائی۔

گیارھویں امامؑ

حسن عسکری (علیہ السلام) امام علی نقیؑ کے فرزند تھے۔ ۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ کو متولد ہوئے اور گیارہ برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ سامرہ میں آ کر نظر بندی کے عالم میں قیام کیا۔ اپنے والد کے بعد امام خلق ہوئے اور خاموشی کے ساتھ عبادت و تعلیم شریعت میں بسر کرتے رہے آخر آپ کو معتمد باللہ عباسی نے زہر دلوایا اور ۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ کو ۲۸ برس کی عمر میں شہادت پائی۔

بارھویں امامؑ

حضرت امام مہدی (علیہ السّلام و عجل اللہ فرجہ) امام حسن عسکریؑ کے فرزند ہیں آپ حضرت حجت، صاحب الامر، امام منتظر، مہدی موعود اور قائم آلِ محمدؐ وغیرہ القاب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ اصلی نام آپ کا وہی ہے جو رسول اللہ کا نام ہے۔ مگر یہ آپ کا مخصوص احترام ہے کہ آپ کا نام لینا القاب کی موجودگی میں متروک قرار دیا گیا ہے۔

۱۵ شعبان ۲۵۵ھ کو سامرا میں متولد ہوئے۔ مصلحت الٰہی یہی کہ آپ کو تمام دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا جائے۔ بے شک آپ کے والد بزرگوار کے زمانہ میں بہت سے مخصوص اصحاب امام نے آپ کی زیارت کی حدیثوں میں آپ کی پیدائش کی پیشین گوئی برابر ہوتی رہی تھی اس لیے بادشاہ کی طرف سے آپ کو قتل کرنے کی کوشش تھی مگر اللہ کو ان کی حفاظت آخر زمانہ تک مقصود تھی۔ ہر چند آپ کے والد کے بعد آپ کی تلاش کی گئی مگر تمام کوششیں ناکام ہوئیں۔ بے شک فرائض امامت کو آپ نے پورا کرنا شروع کر دیا ۳۲۹ھ تک آپ کی جانب سے ایک مخصوص نائب مقرر رہا تھا جو شرعی احکام کی اشاعت کرتا تھا مسئلوں پر آپ سے دستخط کراتا تھا اور جو کچھ شیعوں کے مذہبی ضروریات ہوں انھیں پورا کرتا تھا۔ اس زمانہ کو "غیبت صغریٰ" کا زمانہ کہا جاتا ہے اس کے بعد سے اللہ کی مصلحت کا تقاضا ہوا کہ کوئی مخصوص نائب بھی نہ رہے یہ "غیبت کبریٰ" ہے

جب مصلحت الٰہی ہوگی پردہ ہٹے گا اور امام ظہور فرمائیں گے۔

(۵) معاد

انسان کے لئے اس دنیاوی زندگی کے آگے مرنے کے بعد ایک دوسرا دور حیات ہے جس میں اسے موجودہ زندگی میں کئے ہوئے اچھے یا برے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی اسی کو "آخرت" "معاد" "حشر" اور "قیامت" کہتے ہیں جو اسلامی عقائد میں اہم بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

جزا و سزا کی ضرورت

خالق کائنات کی ذات میں علم و قدرت، اس کے افعال میں حکمت و عدالت اور پھر اس کی جانب سے تعلیم و ہدایت کے نظام کو بصورت رسالت ملنے کے بعد جب یہ فرق محسوس ہوتا ہے کہ افراد انسانی میں کچھ اس آئین کے وفادار اور اس کے تعلیمات و ہدایت پر کاربند ہوتے ہیں اور کچھ نافرمان، سرکش اور اس کے تعلیمات سے منحرف نظر آتے ہیں تو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ پہلی اور دوسری جماعت کے درمیان نتیجہ کے اعتبار سے بھی کچھ امتیاز ہو۔ اسی امتیاز کا نام "جزا و سزا" ہے

جزا و سزا کے لئے دوسری زندگی

یہ مشاہدہ ہے کہ موجودہ زندگی بعض نیکوکار افراد کی تمام مصائب میں گذر جاتی ہے اور کبھی راحت نصیب نہیں ہوتی اور بعض بدکار افراد کی تمام راحت و مسرت میں بسر ہوتی ہے کبھی کسی تکلیف سے دوچار ہونا نہیں پڑتا اس سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جزا و سزا کے لئے

یہ دورِ حیات نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ایک دوسرا دور ہے جو اس زندگی کے خاتمہ کے بعد پھر دوبارہ آئیگا۔ اسی دوسرے دور کو قرآن میں "آخرت" کہا گیا ہے۔

دوسری زندگی کس طرح؟

"انسان" صرف عناصر میں ظہور ترکیب کا نام نہیں ہے تاکہ اس ترکیب کے پہلے وہ وجود نہ رکھتا ہو اور "ان اجزاء کے پریشان" ہونے کے بعد اُسے بالکل نابود سمجھ لیا جائے بلکہ اس جسم کے علاوہ ایک شے ہے جسے "روح" کہتے ہیں۔

روح جسم سے الگ ایک مخلوق ہے۔ عناصر کی ترکیب کے بعد روح کے تعلق کا اس جسم سے قائم ہونا اس کی زندگی ہے اور پھر اس تعلق کا ختم ہوجانا موت ہے مگر روح اس کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ پھر جب اللہ چاہے گا انہی عناصر کی ترکیب کے بعد اسی روح کا علاقہ قائم کردے گا وہی اس شخص کی دوبارہ زندگی کا دور ہوگا جسے "معاد" کہتے ہیں۔

برزخ

مرنے کے بعد سے اس دوبارہ زندگی تک کے درمیانی دور کو "عالم برزخ" کہتے ہیں۔ اچھے اور برے اعمال کے آثار سے راحت یا تکلیف کی صورت میں انسان کی روح کو اسی عالم میں کچھ نہ کچھ دوچار ہوجانا پڑتا ہے۔ اب اگر جرم ہلکا ہے تو بسا اوقات اتنے ہی میں اس کی سزا ختم ہوجاتی ہے اور اگر جرائم شدید ہیں تو مختتم طور پر سزا کا حکم "آخرت" میں سنایا جائیگا۔

حساب و میزان

دنیا میں بسا اوقات انسان کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوتے ہیں۔ اسے اپنی برائیوں کا احساس نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی اپنی نیکیوں کے متعلق وہ خود غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے۔ ریاکاری اور تصنع کے جذبات بعض وقت دل و دماغ کے اندر اتنی گہرائی میں ہوتے ہیں کہ خود آدمی اُن کی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔ آخرت میں اُس کی اچھائیوں اور برائیوں کا اس طرح نمایاں ہوجانا کہ خود انسان کو بھی اُن کا پورا پورا اندازہ ہوجائے "حساب" ہے اور اسی کی زیادہ نمایاں شکل کو "میزان" کہا گیا ہے۔

جزا اور سزا سے پہلے حساب اور میزان میں عمل کی جانچ کا سامنے آنا ضروری ہے۔

جنت و نار
یعنی
بہشت و دوزخ

یہ سچ ہے کہ نیکی اور بدی میں جو ذاتی اچھائی اور برائی ہے وہ خود اُن کی پابندی کے لئے محرک قوی ہے لیکن یہ تقاضا بلند نظر افراد کے لئے بس اس کا باعث ہے کہ اُن کے پیش نظر اس پابندی میں کسی صلے کی امید یا سزا کی دہشت نہ ہو۔ چنانچہ اسلام کے مقدس و معصوم رہبروں نے اس بلندی نظر کی دعوت دی ہے کبھی خود اپنے معیار نظر کو اپنے کردار سے پیش کرتے ہوئے بصورت مناجات "خداوندا میں

www.kitabmart.in

نے تیری عبادت تیری جنت کی لالچ یا تیرے دوزخ کے خوف سے نہیں کی ہے بلکہ تجھے مستحق عبادت سمجھا ہے اس لئے عبادت کی ہے۔ (حضرت علی ابن ابی طالبؑ)

اور کبھی کلیہ کے طور پر بطور بیان واقعہ اس طرح کہ:

"کچھ اشخاص اللہ کی عبادت جنت کی لالچ میں کرتے ہیں۔ یہ مزدوروں کی سی عبادت ہے۔ اور کچھ لوگ اس کی عبادت دوزخ کے خوف سے کرتے ہیں یہ غلاموں کی سی عبادت ہے اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو عبادت صرف اس کی خوشنودی کے لئے کرتے ہیں۔ یہ آزاد منش افراد کی عبادت ہے" (امام جعفر صادقؑ)

یہ تو خود عمل کرنے والے کی بلندی نظر کا اقتضاء ہے مگر عادل و مقتدر حاکم کے عدل کا اقتضا کیا ہے؟ کیا یہ کہ وہ نیکوکار اور بدکردار کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے؟ ہرگز نہیں۔

لہذا جنت کی طمع اور جہنم کا خوف بندہ کے پیش نظر نہ سہی مگر خالق کی طرف سے نتیجہ میں اس طرح کی تفریق ضروری ہے۔

پھر یہ کہ افراد انسانی سب یکساں طور پر بلند نظر تو نہیں ہیں اور حکمت الٰہی زیادہ سے زیادہ افراد کو پابند قانون بنانے کی متقاضی ہے

یہ ایک عملی مذہب کی شان نہیں ہے کہ وہ صرف خوبصورت معیاری تصورات پیش کر دینے پر اکتفا کرے بلکہ وہاں ایک طرف بلندی نظر کی دعوت کے طور پر ...

دوسری طرف حقیقت پسندی کے پیش نظر اس واقعہ کے ماتحت کہ بہر حال تمام انسان اتنے بلند نظر نہیں ہیں، اُن کی افتادِ طبع کے لحاظ سے طمع اور خوف کے دھارے کو صحیح راستے پر لاتے ہوئے اطاعت اور پابندی کے محرکات بھی مہیا کر دیے گئے کیونکہ یہی دونوں محرکات اکثر راہ حق ونیکی سے ہٹانے والے ثابت ہوتے ہیں۔ اب اگر آخرت پر یقین پیدا ہو جائے تو یہی دونوں جذبے حق اور نیکی پر قائم رکھنے والے بن جائیں گے اسی لیے جنت کے تذکرہ میں حور و قصور اور شراب طہور وغیرہ کا ذکر کیا گیا جس میں یہ حکیمانہ راز مضمر ہے کہ جس قسم کی نفسانی خواہشوں سے دنیا میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان ہی خواہشوں کو ان خرابیوں کے انسداد کا ذریعہ اور جن جذبات کی مطلق العنانی انسان کو بہیمیت و حیوانیت کی جانب لے جایا کرتی ہے انہی جذبات کو انسانی فرائض کے احساس کا سبب بنا دیا جائے اس مقصد سے نعمات بہشت کے وعدے اور ان وعدوں کی وفا کے لیے ان کا حقیقی وجود دونوں ضروری ہیں۔

ردِّ تناسخ

اسلام نے جس جزا و سزا کا تصور پیدا کیا ہے اس کے یہی وہ مقاصد و فوائد ہیں جو اس جزا و سزا سے نہیں پورے ہوتے جسے "تناسخ" یا "آواگون" کی صورت میں بعض اہل مذاہب نے تسلیم کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد روح پھر دنیا میں کسی ماں باپ کے

یہاں ایک نومولود کی صورت میں پیدا ہوتی ہے جو اس کا دوسرا جنم ہوتا ہے۔ اس جنم میں اسے جو راحت و آرام ملتا ہے وہ پہلے جنم کے اعمال کی جزا ہوتا ہے اور جو تکلیفیں ہوتی ہیں وہ اس جنم کے اعمال کی سزا ہوتی ہیں۔ کبھی یہ دوسرا جنم انسان نہیں بلکہ مختلف جانوروں درختوں یا کیڑے اور پرندوں کی شکل میں ہوتا ہے یہ جنم بھی بعض اعمال کی سزا ہوتے ہیں۔

اس میں بڑا نقص یہ ہے کہ دوسرے دور میں شعور و احساس کے فقدان یا اس کی کمی سے جزا و سزا کا مفاد ہی ختم ہوجاتا ہے۔

پھر جبکہ موجودہ ہر جنم سابق کرم (عمل) کا نتیجہ ہیں تو اس کے تمام خصوصیات و لوازم جبر کی حیثیت رکھتے ہیں لہذا اس پر آئندہ کسی جزا و سزا کا مرتب ہونا خود اصول عدالت کے خلاف ہے

مسخ اور تناسخ

بطور عذاب بعض امتوں کا مسخ ہونا بے شک قرآن سے ثابت ہے مگر اسے تناسخ سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

مسخ کے پہلے آدمی مرتا نہیں بلکہ اسی زندگی میں یعنی اس روح کے اس جسم میں رہتے ہوئے اس جسم کی شکل انسانی صورت کے بجائے کسی جانور کی سی ہوجاتی ہے جو انسان کیلئے ایک توہین آمیز شکل ہونے کی وجہ سے باعث تکلیف اور دوسروں کے لئے سبب عبرت ہوتی ہے مگر تناسخ کے معنی

جسم سے خارج ہو گئی پھر کسی آدمی یا جانور کی طرح کے جسم میں داخل ہو کر دوبارہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی۔

یہ مسخ سے بالکل مختلف چیز ہے لہذا قرآن کی اُن آیتوں کو جو مسخ کا اظہار کرتی ہیں تناسخ کے ثبوت میں پیش کرنا بالکل غلط ہے۔

عقیدۂ تناسخ کی اصولی کمزوریاں

(۱) تناسخ کی بنیاد اس پر ہے کہ روح اور مادّہ قدیم ہے اس لئے روح کا مختلف قالبوں میں تنقل و حرکت کا سلسلہ لامتناہی ہے مگر روح اور مادّہ کے انقلابات و تغیرات خود اُن کے حادث ہونے کا پتہ دیتے ہیں اس کو قدیم ماننا جو اس عقیدہ کا اصل اصول ہے وہی باطل ہے

(۲) تناسخ والے ہر جنم کو کرم کا پھل قرار دیتے ہیں اور پھر اس سلسلہ کو لامتناہی کہتے ہیں حالانکہ اگر گزشتہ جنم والے اعمال کی سزا میں حیوانات یا نباتات کی شکل میں روح منتقل ہو گئی تو اب اعمال کا کوئی سوال باقی نہیں رہا لہذا اس کے بعد کسی دوسرے جنم میں منتقل ہونے کی ضرورت بھی نہ رہی اور اس طرح یہ سلسلہ یہاں ختم ہو جانا چاہیے۔ اس لئے کہ جب سابقہ اعمال کی سزا ہو گئی اور اب کوئی اعمال ہوئے نہیں تو جزا و سزا کا محل ہی کہاں باقی رہا۔

(۳) تناسخ کے نقطہ نظر سے روحیں لامتناہی ہیں کرم یعنی عمل انسانی جنم سے مخصوص ہے۔ دوسرے جنم یعنی حیوان، نباتات یا جماد

یا تکلیف ہوتی ہے وہ گزشتہ جنم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی بھی ماسبق دور میں جتنی انسانوں کی تعداد مانی جائے ان میں سے تھوڑے ہی وہ ہوں گے جو پھر انسان کے جنم میں آئیں۔ باقی پتھروں درختوں یا جانوروں کے جنم میں جائیں گے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کی مردم شماری ہمیشہ کم ہوتی رہے اور یہ تعداد ہمیشہ ہی گھٹتی رہے۔ حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف بتاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حیوان، نباتات یا جماد کے دورے گزر کے اور سزا حاصل کر کے پھر روحیں پاک ہوتی اور انسان کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں تو یہ افراد انسانی جو اس دور کو ختم کر کے آنے والی روحوں کے حامل ہیں ان کو اپنے تمام دور حیات میں نہ کوئی رنج ہونا چاہیئے نہ کوئی خوشی۔ نہ آرام ملنا چاہیئے نہ تکلیف کیونکہ یہ سب باتیں تو جزاء سزا کا نتیجہ ہوتی ہیں حالانکہ یہ بالکل مشاہدہ کے خلاف ہے۔ دنیا میں کوئی بشر مسرت و رنج اور راحت و تکلیف سے خالی نہیں ہے۔

(۴) جتنے وہ بچے جو پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں انھیں دنیا میں نہ چین نصیب ہوتا ہے نہ اذیت۔ اس کا کچھ سبب معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ روح کے نئے جنم میں لانے کا مقصد تو ان لوگوں کے نزدیک صرف جزاء و سزا ہے۔

اگر کہا جائے کہ اس دنیا میں آ کے مر جانا ہی جزاء و سزا کے لئے کافی ہے تو پھر اس سلسلہ کے چلنے کا کوئی باعث نہیں ہے اس لئے کہ اس دور میں اعمال کوئی نہیں ...

(۵) جانور کی شکل میں ظاہر بلخود گزشتہ اعمال کی سزا ہے اور وہ اس شکل میں آنے سے پوری ہوگئی تو اب ان جانوروں کو جو تکلیفیں اپنی زندگی میں پیش آتی ہیں وہ کس جرم کی سزا سمجھی جائیں گی؟

(۶) عقلی طور پر جزاء کا مفہوم ہمیشہ اس کا متقاضی ہے کہ عمل اس سے مقدم ہے اس لئے جزار کے سلسلہ کی مجموعی مقدار سے مقدم عمل کا تفوق لازمی ہے اور وہ ایسا عمل ہوگا جو بطور جزاء نہ ہو اسی طرح یہ سلسلہ لازماً متناہی ہو جائے گا اور جب شروع میں انتہا اس کی ہوگئی تو آخر میں ایک ایسی جزاء و سزا کا بھی تصور کیا جا سکے گا جس کے ساتھ اعمال کا سوال نہ پیدا ہو یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

(۷) انسان حقیقتاً جو ڈرتا ہے وہ اپنی تکلیف اور نفس کی اذیت سے کیسی ہی حالت ہو مگر وہ یہ سمجھ لے کہ اس میں کوئی ایذا نہیں ہے تو وہ ہرگز اس سے کوئی خوف نہ کرے گا۔

انسان کا آئندہ جنم میں کسی شکل میں منتقل ہو جانا افراد انسانی کو متاثر نہیں کر سکتا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس جنم میں وہ ظاہر ہوں گے ان کی فطرت وطبیعت اسی جنم کے مطابق ہوگی اور انھیں ہرگز اس میں کسی نفسانی اذیت اور تکلیف کا احساس نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ دیوانہ ہو جانا ایک انسان کے لئے کتنا ہی قابل افسوس ہو مگر یہ افسوس دوسرے کرتے ہیں وہ خود ہرگز اس پر متاسف نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ اس میں ایک کیف اور لذت محسوس کرے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے۔

اور پھر اگر سزا کی نوعیت اس انسان کی افتاد طبع کے مطابق ہوئی مثلاً غلہ کے چور کو چوہے کی شکل یا پانی کے چور کو مینڈک کی شکل اور کسی بڑے مقدس انسان کے قاتل کو گائے کی شکل دے دی گئی تو بات ہی کیا ہوئی بلکہ آخری صورت میں تو وہ خود بہت آدمیوں کے نقطہ نظر سے قابل عزت بلکہ لائق پرستش ہو جاتا ہے۔

ان سزاؤں کا سننا مجرم افراد کے دل و دماغ پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا برخلاف جزا و سزا کی ان تصویروں کے جو اسلام نے پیش کی ہیں جن میں زیادہ نمایاں راحت یا تکلیف و الم کا احساس ہے

(۷) نیکی اور بدی کے اثرات اکثر و بیشتر آئندہ نسلوں تک برقرار رہتے ہیں اس لئے جب تک یہ پورا دور منقضی نہ ہو جائے اس نیکی اور بدی کے حدود کا تعین ہی نہیں ہوتا لہذا ضرورت ہے کہ جزا و سزا کا ہنگام اس پورے دور حیات دنیا کے اختتام کے بعد ہو۔ جب اچھے اور برے تمام اعمال کے اثرات پورے طور پر وقوع میں آچکے ہوں اور اسطرح میزان میں ہر عمل کا وزن پورے طور پر نمایاں ہو سکے۔

دنیاوی جزا و سزا

بے شک اسلامی عقیدہ میں بھی اس دنیا کی جزا و سزا کا پتہ ملتا ہے مگر وہ ہر شخص کو خود اس جنم میں کہ جس میں اس نے اعمال کئے ہیں۔

ممکن ہے کہ اس کو بعض نعمتیں عطا ہوں اس کے کسی نیک عمل کی

جزا میں یا کوئی مصیبت ڈالی جائے اس کے کسی برے عمل کی سزا میں مگر اس سے روز آخرت کی ضرورت اور اس کی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جس طرح قرآن کا یہ ارشاد کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ جس کا مفاد یہ ہے کہ اللہ کے انعام وعطا میں تغیر ان کے نفسانی حالات کی تبدیلی کا نتیجہ ہوتا ہے انسان کیلئے اصلاح نفس اور اپنے اعمال کا جائزہ لینے کی ایک موثر تحریک ہے۔

دائمی جزا و سزا کی ضرورت

غور کیا جائے تو اس دنیا کی ہر مسرت اور ہر تکلیف ناپائدار ہے مگر جیسا کہ سابق میں ضمناً تذکرہ ہو گا انسانی کردار میں بعض نیکی اور بدی ایسی ہوتی ہے جو اپنے نتائج کے اعتبار سے دائمی ہوتی ہے۔ جیسے کسی ایسے کار خیر کا اجرا جس پر آنے والی نسلیں عمل کرتی رہیں یا کسی ایسے فتنے کا بپا کرنا جس سے آنے والی نسلوں میں ہمیشہ کے لئے فتنہ وفساد کی بنیاد قائم ہو جائے۔

پھر افعال تو کبھی وقتی ہوتے بھی ہیں مگر نفس کی راسخ کیفیت ایمان اور اس کے بالمقابل کفر یہ کوئی اعضاء کا عمل نہیں ہے جس کا ایک وقت معین پر صدور ہو بلکہ یہ روح میں قائم شدہ ملکات ہیں جن میں سے ایک جزا کا مستحق اور ایک سزا کا حقدار ہے۔

ایسے افعال اور ان ملکات کی جزا وسزا کے لیے جب تک مختتم اور دائمی نعمت اور عذاب کا عالم تسلیم نہ کیا جائے عدلِ الٰہی کا تقاضا

دوسرا حصّہ

فروع دین

یعنی

اسلام کے عملی ارکان

(۱) نماز

اسلامی احکام میں سب سے بڑی اہمیت "نماز" کی ہے۔ یوں تو اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ بندہ اپنے خالق کو کسی وقت فراموش ہی نہ کرے۔ یہی مستقل اللہ کی یاد فرائض کے احساس کا اصلی سرچشمہ ہے۔ مگر اس یاد کی علامت کے طور پر جو خاص عبادت لازمی طور پر قانون اسلام کا جزء قرار دی گئی اس کا نام "نماز" ہے

نماز کے اوقات

اوقاتِ نماز کو چوبیس گھنٹے میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ انسان اپنے ضروریات زندگی انجام بھی دیتا ہے اور ضروریات زندگی کی رو میں وہ یادِ الٰہی سے غافل بھی نہ ہونے پائے اور اس طرح اس کی پوری زندگی کے مشاغل اس احساس کے ساتھ گزریں کہ وہ ایک مدبر اعلیٰ کے زیر نگرانی ہے جو ذرہ بھر بے اعتدالی کو پسند نہیں کرتا یہی احساس اگر قوی اور مستقل ہو جائے تو وہی انسان کو ہر قسم کے "گناہ" سے باز رکھنے کے لیے کافی ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشآء والمنکر یعنی نماز ہر گناہ اور برائی سے روکنے والی چیز ہے۔

پنجگانہ نمازیں

ان ہی اوقات کے لحاظ سے شب و روز میں پانچ نمازیں مقرر کی گئی ہیں۔

(۱) صبح - اس کا وقت سفیدۂ سحری ظاہر ہونے کے بعد سے

سورج کے نکلنے تک ہے۔ اس نماز کی پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ تن آسانی اور عیش پسندی ختم ہوتی ہے اور دن کا کوئی حصّہ سونے میں بے کار نہیں جاتا۔

(۲) ظہر۔ دوپہر کو جب دن ڈھلنے لگتا ہے اُس وقت سے اس کا وقت شروع ہوتا ہے۔

(۳) عصر۔ دوپہر کو ظہر کی نماز کے بعد سے عصر کا وقت ہے مغرب تک۔

(۴) مغرب۔ سورج کے ڈوبنے کے بعد جب سمت مشرق شب کی سیاہی پھیل جائے۔

(۵) عشاء۔ مغرب کے بعد سے آدھی رات گئے تک۔

رکعات

جب سے نماز میں کھڑے ہوے اور جو کچھ پڑھنا ہے وہ پڑھا، اس وقت سے رکوع اور دو سجدے کرنے تک کو شرع میں "رکعت" کہا جاتا ہے۔

فریضہ نمازوں میں صرف پہلی یعنی صبح کی نماز دو رکعت ہے اور مغرب کی نماز تین رکعت ہے۔ باقی سب یعنی ظہر، عصر اور عشا چار چار رکعت ہیں۔

جس نماز میں جتنی رکعتیں ہیں اتنی تعداد میں رکوع ہوتے ہیں اور اس کی دونی تعداد میں سجدے کرتے ہیں۔

طہارت

نماز کی حالت میں آدمی کا جسم اور لباس پاک ہونا چاہیے۔

اس میں کسی قسم کی نجاست نہیں ہونا چاہئے اور پھر اس کے بعد
نماز کے پہلے وضو اور خاص خاص حالتوں میں غسل اور ان دونوں
سے معذوری کی شکل میں تیمم کرنا ہوتا ہے۔

وضو کیا ہے؟ رضائے الٰہی کی نیت سے منھ اور دونوں
ہاتھوں کا کہنیوں سے انگلیوں کی نوکوں تک پانی سے دھونا
اور سر کے آگے کے حصہ پر اور پیروں پر گٹنوں تک تر ہاتھ کا پھیرنا۔

غسل۔ رضائے پروردگار کی نیت سے اس طرح نہانا کہ پہلے
سر و گردن کو دھوئے پھر جسم کا داہنا حصہ اور پھر بایاں حصہ یا نیت
کے ساتھ ایک ہی بار کسی نہر وغیرہ میں غوطہ لگا لینا۔ اور

تیمم جو وضو اور غسل سے معذوری کی حالت میں واجب ہوتا ہے
نیت کے ساتھ مٹی سے پیشانی اور ہاتھوں کی پشت پر ہاتھ کا
پھیرنا ہے۔

قبلہ

نماز کے وقت ہر مسلمان کو وہ جہاں بھی ہے کعبہ کی طرف
رخ کرنا ضروری ہے۔ یہ اسلامی تنظیم کا ایک طاقتور نشان
ہے اسی کو قبلہ کہتے ہیں۔

لباس

مرد کیلئے بالکل برہنہ جسم سے اور عورت کے لیے چہرہ اور
دونوں ہاتھوں کے سوا تمام جسم کے چھپائے بغیر نماز درست

نہیں ہے۔ تنہائی یا تاریکی وغیرہ میں بھی اس مقدار میں لباس نماز کے لئے ضروری ہے۔

اذان

نماز کے لئے لوگوں کو اطلاع دینے کے لئے اذان کا حکم ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ بلند آواز سے چار مرتبہ کہے۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ "اللہ سب سے بڑا ہے"

دو مرتبہ اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

"میں اقرار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں"

دو مرتبہ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ

"میں اقرار کرتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفےٰ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں"

اس کے بعد دو مرتبہ جزو ایمان ہونے کی حیثیت سے کہا جاتا ہے

اَشْھَدُ اَنَّ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلِیًّا وَلِیُّ اللّٰہِ وَصِیُّ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَ خَلِیْفَتُہٗ بِلَا فَصْلٍ

"میں اقرار کرتا ہوں کہ حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالبؑ ولی خدا اور وصی رسول خداؐ اور حضرت رسولؐ کے بلا واسطہ جانشین ہیں"

پھر دو مرتبہ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ "نماز کے لئے تیار ہو"

پھر دو مرتبہ حَیَّ عَلَی الْفَلَاح "دین و دنیا کی بہتری حاصل کرنے چل پڑو"

پھر دو مرتبہ حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَل "سب سے بڑے نیک عمل کے

نے آگے بڑھو" پھر دو مرتبہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ" اللہ سب سے بڑا ہے" اور دو مرتبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کوئی سچا معبود نہیں ہے سوا اللہ کے" نقارہ، بھوپو اور سیٹی وغیرہ کے جتنے ذریعے دنیا نے ایجاد کئے ہیں ان سب سے اس طریقۂ اعلان "اذان" کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں ایک آواز ہی نہیں بلکہ پورا وہ پیغام ہے جو دین اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔

اقامت

نماز کے لئے کھڑے ہونے کے وقت جماعت میں نمازیوں کو نماز کے لئے بالکل مہیا کرنے اور فرادیٰ میں خود اپنے ذہن کو پوری طرح متوجہ کرنے کیلئے اقامت کا حکم ہے جس کے الفاظ بہت زیادہ اذان سے ملتے ہوئے ہیں مگر یہاں شروع میں اَللّٰہُ اَکْبَرُ چار کے بجائے دو ہی دفعہ ہے اور حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلِ کے بعد دو دفعہ کہا جاتا ہے قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ (یعنی) "نماز اب قائم ہو گئی ہے" اور آخر میں بجائے دو کے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ایک دفعہ ہی ہے۔

نیت

دوسرے بعض مذاہب میں عبادت گیان اور دھیان سے وابستہ ہے۔ اسلام چونکہ روح کے ساتھ جسم کو بھی شریک عبادت رکھتا ہے اس لئے یہاں عبادتیں کچھ اعضائے جسمانی کے حرکت و عمل سے متعلق بھی ہیں مگر ان میں نیت یعنی اس فعل کے تمام خصوصیات کے ساتھ رضائے الٰہی کی خاطر اس کا قصد لازم ہے بطرح

اس میں اعضاء و جوارح کے ساتھ دل و دماغ کی لازمی طور پر شرکت ہو گئی ہے۔ عبادت بغیر نیت کے صحیح نہیں ہو سکتی۔

تکبیرۃ الاحرام

قبلہ رخ سیدھے کھڑے ہو کر نیت کے ساتھ دونوں ہاتھ اٹھا کر کانوں تک لے جائے اور اس قصد سے کہ ان الفاظ کے ساتھ نماز شروع ہو رہی ہے کہے اَللّٰہُ اَکْبَرُ "اللہ سب سے بڑا ہے"۔

یہ نماز کا پہلا رکن یعنی اہم جزو ہے جس کے عمداً سہواً یا ناواقفیت کی صورت میں ہر طرح ترک ہونے سے نماز نیست و نابود ہو جاتی ہے۔

قرات

اس کے بعد سورہ الحمد پڑھے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝

(ترجمہ): "سہارا اللہ کا جو سب کو فیض پہونچانے والا بڑا مہربان ہے"

ہر طرح کی تعریف اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ وہ جو سب کو فیض پہونچانے والا بڑا مہربان...

اے ایک سپاسنامہ سمجھنا چاہیے جسے بندہ اپنے مالک کے دربار میں
حاضری کے بعد پیش کر رہا ہے) "تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور
تجھی سے مدد کے طالب ہیں۔ ہمیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت فرما
ان کا راستہ جنھیں تو نے اپنی نعمت سے سرفراز کیا ہے۔ اُن کا نہیں جن
پر تیرا غضب نازل ہوا ہے اور نہ اُن کا جو گمراہ ہیں"۔
ترجمہ کو ذہن میں رکھے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن نماز میں ترجمہ
کا پڑھنا جائز نہیں ہے۔

سورہ

سورۂ الحمد کے بعد کوئی دوسرا سورہ پڑھنا چاہیے۔ اس سورہ کی
کوئی تعیین نہیں ہے۔ جو سورہ بھی چاہے پڑھے۔ بس وہ چار سورے
نہ پڑھے جن میں سجدہ واجب ہے اور بہتر یہ ہے کہ سورۂ فلق سورۂ
ناس۔ الم نشرح اور والضحیٰ۔ لایلاف اور سورۂ فیل بھی نہ پڑھے۔
باقی ہر سورہ پڑھ سکتا ہے۔
عموماً اس رکعت میں سورۂ انا انزلنا پڑھا جاتا ہے جو ذیل میں درج
کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انا انزلناہ فی لیلۃ القدر ۝ وما ادراک ما لیلۃ القدر ۝
لیلۃ القدر خیر من الف شھر ۝ تنزل الملئکۃ والروح
فیھا باذن ربھم من کل امر ۝ سلام ھی حتی مطلع الفجر ۝
(شروع کرتا ہوں) سہارا اللہ کا جو سب کو فیض پہونچانے والا بڑا مہربان

ہے۔ ہم نے اسے شب قدر میں اتارا۔ تمھیں کیا خبر کہ شب قدر کیا چیز ہے۔ شب قدر ہزار ماہ سے بہتر ہے۔ فرشتے اور روح القدس اس میں اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں۔ وہ ہر بات سے سلامتی کا ذریعہ ہے سفیدۂ سحر ظاہر ہونے تک۔"

رکوع

سورہ حمد اور دوسرے سورہ کے پڑھنے کے بعد تکبیر یعنی اللہ اکبر کہے پھر رکوع کرے یعنی اتنا جھک جائے کہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں گھٹنوں کے اوپر پہونچ جائیں۔ پھر تین مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰہ (یعنی "ہر نقص و عیب سے بری ہے اللہ") یا ایک مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ وَ بِحَمْدِہٖ (یعنی ہر نقص و عیب سے بری ہے میرا پروردگار جو بڑی عظمت والا ہے اور اسی کے لئے ہر تعریف ہے) کہے۔ بہتر یہ ہے کہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ وَ بِحَمْدِہٖ کو کم از کم تین بار کہے

قیام بعد از رکوع

رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہو اور مستحب یہ ہے کہ اس حالت میں کہے:۔ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہ "اللہ سنتا ہے اس کی جو اس کی ثنا و صفت ادا کرے"۔ یہ اس تصور کی تجدید ہے کہ نماز میں بندہ گویا اپنے خالق کی بارگاہ میں حاضر ہے۔ یہ اسے نہیں دیکھتا ہے وہ تو اسے دیکھ

جتنا قوی ہو اتنا ہی نماز میں خضوع و خشوع کا سبب ہے۔

سجدہ

اس کے بعد جھکے اور پیشانی زمین پر رکھے اس طرح کہ پیشانی کے علاوہ دونوں ہاتھوں کے نیچے اور دونوں گھٹنے اور دونوں پیروں کے انگوٹھے بھی زمین پر ٹکے ہوئے ہوں۔

پیشانی کے نیچے زمین کا کوئی جزء ہو یا ایسی شے جو زمین سے اگتی ہے جیسے لکڑی یا پتا مگر شرط یہ ہے کہ وہ پہننے اور کھانے کی چیز نہ ہو سجدہ کی حالت میں مثل رکوع کے یا تو تین دفعہ سُبْحَانَ اللّٰہ کہے یا ایک مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی وَبِحَمْدِہٖ۔ بہتر یہ ہے کہ اسی کو تین مرتبہ کہے۔

پہلے سجدہ کے بعد سر اٹھا کر سیدھا بیٹھے، اللہ اکبر کہے اور اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ "میں بخشش کا طالب ہوں اپنے پروردگار اللہ سے اور اس کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں"

اس کے بعد اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر مثل سابق دوسرا سجدہ کرے اور اس کے بعد سر اٹھائے، یہاں پر پہلی رکعت ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری رکعت اور اس کی قرأت

اب دوسری رکعت کے لیے بِحَوْلِ اللّٰہِ وَقُوَّتِہٖ اَقُوْمُ وَاَقْعُدُ (یعنی۔ اللہ ہی کی دی ہوئی قوت و طاقت سے کھڑا ہوتا اور بیٹھتا ہوں)

کہہ کر پھر سیدھا کھڑا ہو اور مثل سابق سورہ الحمد اور کوئی دوسرا سورہ
ان ہی شرائط کے ساتھ جن کا بیان پہلے ہو چکا ہے پڑھے۔ بہتر یہ
ہے کہ سورہ قُلْ هُوَ اللّٰہ پڑھے جو حسب ذیل ہے:۔

یہ سورہ قرآن کے سوروں میں سب سے افضل ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۙ
وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

(یعنی) "تمھارا قول ہونا چاہیے کہ وہ اللہ واحد حقیقی ہے۔ اللہ برابر
مالک مقصد حاجات ہے۔ اُس کے کوئی اولاد نہیں۔ نہ وہ کسی دوسرے
کی اولاد ہے اور نہ اُس کا کوئی مد مقابل ہے۔"

جہر و اخفات

صبح، مغرب اور عشا کی نماز میں سورے آواز سے پڑھے جائیں
گے جس کو جہر کہتے ہیں اور ظہر و عصر میں چھپکے چھپکے جس کو اخفات
کہتے ہیں۔ یہ تفریق مردوں کے لئے ہے لیکن عورتوں کو سب نمازیں اخفات
کے ساتھ پڑھنا چاہئیں۔

قنوت

دوسری رکعت میں سوروں کے بعد اللہ اکبر کہہ کر دونوں
ہاتھ اپنے چہرہ کے سامنے رکھے اس طرح کہ ہتھیلیاں آسمان کی طرف
ہوں اور قنوت پڑھے جس کا مطلب ہے بارگاہ الٰہی میں کوئی التجا پیش کرنا

اس کے لئے الفاظ کی کوئی تعیین نہیں ہے۔ ایک قنوت کے الفاظ جو وارد ہیں حسب ذیل ہیں:۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَعَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

(یعنی) "اے اللہ ہم کو بخش دے۔ ہمیں اپنے رحم و کرم سے سرفراز کر ہمیں سلامتی عطا فرما اور ہمیں معاف کر۔ دنیا اور آخرت دونوں میں یقیناً تو ہر بات پر قادر ہے"

یہ قنوت اس اسلامی تعلیم کا مظہر ہے کہ نہ دین کو فراموش کریں اور نہ دنیا کو بلکہ دونوں کی کامیابی کے طلبگار رہیں۔ یہ دعا اس خصوصیت کی حامل ہے۔

اس کے بعد پھر رکوع کرے اور سر اٹھا کر اسی طرح کہے۔ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ اور پھر دونوں سجدے اسی طور پر کرے۔

تشہد

دوسری رکعت کے سجدوں کے بعد سر اٹھا کر بیٹھے اور اللہ اکبر کہنے کے بعد تشہد پڑھے:۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ "میں اقرار کرتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفےٰ ؐ اس کے بندۂ خاص اور اس کے پیغمبر ہیں۔ اے اللہ درود بھیج محمد و آلِ محمد پر"

سلام

اگر دو رکعت والی نماز ہو جیسے نماز صبح تو اسی تشہد کے بعد سلام پھیرے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ ان میں پہلا سلام مستحب ہے اور اس کے بعد کا واجب اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَ رَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَ عَلٰی عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِیْنَ اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهٗ۔

"سلام آپ پر اے رسول خدا اور اللہ کی رحمت سلام ہم پر اور تمام اللہ کے نیک بندوں پر۔ سلام تم پر اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں۔"

اس تم سے مراد۔ نماز جماعت میں تمام شرکائے جماعت ہوتے ہیں اور فرادی میں ذہنی استحضار کے طور پر اللہ کے سب بندے جو اس وقت دنیا میں موجود ہیں۔

یہ گویا سابق التجا کی قبولیت کا اللہ کی طرف سے مژدہ ہے جو سب کو سنا دیا جاتا ہے۔

تسبیحات اربعہ

اگر نماز تین رکعت والی ہو جیسے مغرب تو دوسری رکعت میں تشہد پڑھنے کے بعد سلام پھیرے بلکہ کھڑا ہو جائے اور یا تو سورۂ حمد اکیلا پڑھ لے یا تین مرتبہ تسبیحات اربعہ پڑھے۔ سُبْحَانَ اللهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَ اللهُ اَكْبَرُ "ہر نقص و عیب

سے بری ہے اللہ اور سب تعریف اللہ کے لئے ہے اور کوئی سچا معبود نہیں سوا اللہ کے اور اللہ سب سے بڑا ہے۔
اس کے بعد اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر رکوع کرے، کھڑا ہو اور مثل سابق دونوں سجدے کرے اور اب تیسری رکعت کے بعد پھر تشہد پڑھے اور اس کے بعد سلام پھیرے۔

اگر نماز چار رکعت والی ہو جیسے ظہر و عصر اور عشا تو تیسری رکعت کے سجدوں کے بعد نہ تشہد پڑھے اور نہ سلام بلکہ بِحَوْلِ اللّٰہِ وَقُوَّتِہٖ اَقُوْمُ وَاَقْعُدُ کہہ کر کھڑا ہو جائے اور پھر سورہ حمد یا تسبیحات اربعہ پڑھے۔ اس کے بعد رکوع اور دونوں سجدے مثل سابق کرے اور اس کے بعد تشہد اور سلام پڑھ کر نماز ختم کرے۔

---

(۲) روزہ

"روزہ" احکام اسلام میں نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔

یوں تو روزہ مختلف مذاہب میں ہے مگر اسلام نے جس روزہ کو عبادت قرار دیا ہے وہ طلوع صبح صادق سے غروب تک رضائے الٰہی کی خاطر کچھ خاص امور کو جیسے اکل و شرب وغیرہ ترک رکھنا ہے۔

روزہ کے فوائد

فوائد دو قسم کے ہوتے ہیں۔ روحانی اور مادی۔ روحانی ارتقاء ادراک و معرفت، اور نیک جذبات کے قوت پانے سے ہوتا ہے۔ اور مادی فوائد اپنی ذات سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں اور دوسرے افراد بشر سے بھی۔

روزہ مجموعی طور پر ان تمام فوائد کا حامل ہے۔

سب سے پہلی چیز ارتقائے روحانی جو احساس عبودیت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی احساس عبادت کی اصل روح و حقیقت ہے اور اس سے انسان کو اپنے افعال و اعمال کی نگرانی کا خیال ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جو خالق کی مرضی کے خلاف ہو اسی کا نام ہے تقویٰ۔

روزہ نفس انسان میں اس صفت کو قوت دیتا ہے اس طرح کہ وہ عملی طور پر نفسانی خواہشوں سے مقابلہ کی مشق کرا دیتا ہے۔ وہ زندگی کی ضرورتیں اور نفس کی خواہشیں جن میں آدمی اپنے کو مقید

محسوس کرتا ہے، عملاً ہیچ ثابت ہوتی ہیں اُس غیبی طاقت کے فرمان کے سامنے، اور اسی احساس کی ترقی وہ ہے جو انسان کو اُس کی راہ میں اپنی جان تک کی قربانی پر آمادہ کر سکتی ہے۔

غور کیجئے تو انسانی جذبات ہی تمام جرائم کا سرچشمہ ہیں۔ اور ان جذبات پر قابو حاصل کرنا ہی انسان کی عملی بلندی ہے۔

انسان کا کمال یہ نہیں ہے کہ اسے غصہ آئے ہی نہ۔ غصہ تو انسان کے لئے ایک ضروری چیز ہے جس سے بہت سے قابل تعریف اقدامات بھی عمل میں آتے ہیں لیکن انسان کا کمال یہ ہے کہ غصہ کا بے محل استعمال نہ کرے۔ اسی طرح انسان کا کمال یہ نہیں ہے کہ اس میں خواہشوں کی پیداوار ہی نہ ہو۔ ایسا شخص تو مریض ہے۔ بلکہ کمال یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کو صحیح طور پر موقع و محل دیکھنے کے ساتھ پورا کرے انسان اور حیوان میں کردار کے اعتبار سے یہی فرق ہونا چاہئے

روزہ جذبات نفس پر قابو پانے کے لئے ایک بہترین ریاضت ہے۔ اس میں بہت سی حلال خواہشیں جنھیں پورا کرنے پر عموماً انسان مورد الزام نہیں ہوتا، محدود زمانہ تک یکقلم روک دی جاتی ہیں اور اس طرح انسان کی ہر خواہش کے اُس کے قابو میں ہو جانے کا زیادہ امکان پیدا ہوتا ہے اور انسانیت کا جوہر انسان میں ترقی کی منزل پر پہنچتا ہے

اس کے علاوہ روزے سے غریبوں کی تکلیف اور ان کے دکھ درد کی قدر ہوتی ہے۔ یوں عموماً امیروں کو کبھی فاقہ کی تکلیف کا ذائقہ چکھنا ہی نہیں ہوتا۔ روزہ رکھنے کے بعد انھیں بھوک کی تکلیف

کا احساس ہوتا ہے اور اس طرح غرباء کی خبرگیری کا جذبہ پیدا ہوسکتا ہے۔ مادی فائدہ جو روزہ سے حاصل ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ جسم کے اکثر فاسد اخلاط و مواد جو پیٹ میں جمع ہو جاتے ہیں روزہ کے سبب سے تحلیل ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ معدہ کی مشین جو گیارہ مہینے مسلسل چلتی رہتی ہے ٭ لئے ایک ماہ کسی حد تک آرام لینے کا موقع ملتا ہے اور معدہ میں از سر نو طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

اقتصادی حیثیت سے بھی اگر انسان خواہ مخواہ افطار میں کام و دہن کی لذت کا درپے نہیں تو روزہ کی وجہ سے ایک وقت کے کھانے کا پیسہ پس انداز کر کے ٭ لئے کچھ مفید قومی اور مذہبی کاموں میں صرف کیا جا سکتا ہے۔

حفظان صحت کا خیال

اسلام چونکہ روحانیت کے ساتھ انسان کے جسمانی تحفظ کا بھی ذمہ دار ہے، اس لئے اس نے روزہ میں صبر و برداشت کا مطالبہ اسی حد تک کیا ہے کہ انسانی صحت اور زندگی کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے اس لئے لازمی طور پر روزہ کی میعاد صرف طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک رکھ دی ہے۔

صوم وصال یعنی ایک دن سے زیادہ کے مسلسل روزہ کو قطعاً ممنوع قرار دے دیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر انسان بیمار ہو کہ روزہ اسے نقصان پہنچائے یا مسافر ہو تو اس حالت میں روزہ نہ رکھے بلکہ اس کے بعد کسی دوسرے زمانہ میں اس کی قضا کر لے۔

اسی طرح ضعف پیری یا غیر معمولی گرم مزاجی سے پیاس کے غلبہ یا عورت کو حمل و رضاع کے عوارض سے روزہ زیادہ باعث تکلیف ہو تو روزہ کے بجائے فدیہ کا حکم دے دیا گیا کہ ہر روزہ کے بجائے ایک مُد (سوا تین پاؤ غلہ) کسی مسکین کو دے دے پھر ان روزوں کی قضا کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

زمانۂ صوم

روزہ کے وجوب کو ضبط و نظام کے تحفظ کے لئے اسلام نے ایک خاص زمانہ کے ساتھ مقید کر دیا ہے اور وہ ماہِ رمضان ہے جو قمری سال کا نواں مہینہ ہے۔ اگر زمانہ مقرر نہ ہوتا تو کوئی شعبان میں روزے رکھتا۔ کوئی شوال میں۔ کوئی متفرق طور پر۔ اس میں وہ اجتماعی شان پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو اس تعین کے بعد پیدا ہو گئی۔ اس اجتماعی شان کی وجہ سے روزہ کے فرض کا ادا کرنا باوجود طبعاً ناخوشگوار ہونے کے خوشگوار ہو جاتا ہے اس لئے کہ سب ایک رنگ میں ہوتے ہیں۔

مفطراتِ صوم

حسب ذیل اشیاء وہ ہیں جن کا ترک کرنا روزہ میں ضروری ہے۔

(۱) کھانا پینا بقصد و اختیار۔

(۲) بقصد و ارادہ اپنے کو مبتلائے جنابت کرنا، خواہ کسی صورت سے ہو۔ اس لئے کہ بعض اوقات بعض اشخاص کو نگاہ اٹھا کر خود

دیکھنے تک سے خواہ اپنی شریک زندگی تک پر کیوں نہ ہو احتراز
کرنا پڑیگا۔

(۳) رات کو اگر ارادی یا غیر ارادی طور پر ایسا اتفاق ہو تو صبح ہونے تک جان بوجھ کر اسی حالت میں بلا غسل باقی رہنا۔

(۴) غبار غلیظ کو حلق کے نیچے اترنے دینا۔

(۵) عمداً استفراغ کرنا۔

(۶) کسی سیال چیز کا امل لینا۔

(۷) سر کو پانی کے اندر مثلاً حوض وغیرہ میں لے جا کر ڈبونا۔

(۸) خدا و رسول اور ائمہ معصومین علیہم السّلام پر جھوٹ باندھنا یعنی کسی قول و فعل کو ان حضرات میں سے کسی کی جانب غلط طور پر منسوب کرنا۔ اس کا لحاظ رکھنے کی زیادہ تر مقررین اور ذاکرین کو ضرورت ہے۔

چاند

اسلام نے اپنے شرعی احکام میں آفتاب کے سال اور مہینوں کا اعتبار نہیں کیا ہے جس کے لئے حساب دانی کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ چاند کا اعتبار کیا ہے جو محسوس امر ہے چنانچہ روزوں کو بھی قمری مہینے ماہ رمضان میں قرار دیا ہے۔ جب چاند ہو گیا روزہ واجب اور جب دوسرا چاند ہوا (شوال کا) تو روزہ حرام۔

اس کے علم کا اصل ذریعہ مشاہدہ ہی ہے لیکن کبھی کبھی اکثر اوقات
ایسا ہوتا ہے کہ انسان ... کی تحقیق کر ... جا سکا یا نہیں یا یہ کہ

ابر گھرا ہوا اس لیے چاند دکھائی نہ دیا تو اس کے لئے کچھ اور ذرائع بھی قرار دیدیے گئے جیسے دو عادلوں کی گواہی۔ عادل یعنی جن کی فرض شناسی اور پرہیزگاری پر اطمینان ہو۔ اس کے علاوہ مجتہد کا فیصلہ کہ چاند ہو گیا یا چاند کا اس طرح زباں زد خلائق ہونا جس سے انسان کو وثوق پیدا ہو جائے۔ یہ سب باتیں ۲۹ کے چاند کے لئے ضروری ہیں اور اگر ۳۰ تاریخ ہے تو بہر حال چاند کا ہونا یقینی سمجھا جائے گا۔

نیّت

روزہ ایک عبادت ہے اور عبادت بغیر نیت نہیں ہو سکتی نیت کوئی زحمت و مشقت کے ساتھ ذہن میں لایا ہوا تصور نہیں ہے نہ زبان پر لائے ہوئے الفاظ بلکہ نیت اُس قصد کا نام ہے جو محرک عمل ہو۔ آخر آدمی ان مفطرات کو کس لئے ترک کر رہا ہے؟ اس کا باعث حکم خداوندی اور رضائے باری ہونا چاہیئے۔ بس یہی نیت ہے۔ یہ بات ہر روزہ کے رکھتے وقت ہونا چاہئیے۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ شروع میں ایک نیت تیسوں روزوں کے لئے کافی ہے اور ہر روزہ کے لئے نیت کی ضرورت نہیں ہے، غلط ہے۔

ایک خاص رعایت

اصولاً اگر کوئی عمل مختلف اجزاء سے مرکب ہو یا ایک خاص مدت تک قائم رہنے والا ہو تو اس کے ہر جزو کو قصد و ارادہ کے

ساتھ ہونا چاہیے مگر روزہ کے باب میں شرع نے ایک خاص رعایت کی ہے کہ روزۂ واجب میں اگر انسان نے کچھ کھایا پیا نہ ہو تو دوپہر کے قبل تک نیت ہو سکتی ہے۔

ایک اور رعایت

شعبان کی ۲۹ تاریخ کا چاند اگر مشکوک رہا تو ۳۰ شعبان کو ماہ رمضان کے قصد سے روزہ نہیں رکھ سکتا بلکہ اگر چاہے تو سنت کے قصد سے روزہ رکھے پھر اس کے بعد اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ دن ماہِ رمضان کا تھا تو یہ روزہ اسی حساب میں آجائے گا قضا کی ضرورت نہ ہو گی۔

ترک صوم کا کفارہ

ماہِ رمضان میں ایک دن بھی روزہ اگر عمداً نہ رکھے تو گناہ گار ہونگے علاوہ جرمانہ دینا واجب ہے یہ کہ ساٹھ غریبوں کو کھانا کھلائے یا دو مہینے مسلسل روزے رکھے یا بندہ راہِ خدا میں آزاد کرے۔

فی زمانا جبکہ بردہ فروشی قانوناً ممنوع ہے، پہلی ہی دو صورتوں میں تقریباً انحصار ہے۔

یہ کفارہ ادا کرنا ایک مستقل فریضہ ہے نہ یہ کہ کفارہ ادا کرکے انسان فریضۂ صوم سے سبکدوش ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ لوگ اسی کو اپنا شعار بنالیں کہ روزہ نہ رکھیں اور کفارہ ادا کر دیا کریں اس سے وہ پیش خدا مواخذہ سے بری نہ ہوں گے

اگر نعوذ باللہ فعل حرام کے ساتھ روزہ کو ترک کرے مثلاً بجائے
روزہ کے شرابخواری کرے یا ناجائز طور پر عورت سے تعلقات قائم
کرے تو ایسے شخص کیلئے تینوں کفارے ایک ساتھ دینا لازم
ہیں یعنی ساٹھ مسکینوں کو کھانا بھی کھلائے اور دو مہینے مسلسل روزے
بھی رکھے اور ایک بندہ بھی راہ خدا میں آزاد کرے موجودہ زمانہ
میں اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اُن ممالک اسلامیہ میں جہاں بردہ
فروشی ممنوع نہیں ہے جیسے حجاز وغیرہ کسی شخص کے ذریعہ سے روپیہ
بھجوادے اور وہاں کسی غلام یا کنیز کو خرید کر آزاد کرے۔

روزہ کے آداب وقواعد

روزہ تزکیۂ نفس کے لئے ہے۔ اسی لئے ائمہ معصومینؑ نے تاکید
کی ہے کہ روزہ کی حالت میں انسان اپنے زبان و دل و نگاہ بر جسم
جسم کا احتساب قائم رکھے چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب تم روزہ رکھو
تمہارے کان، آنکھ اور جسم کی کھال ہر چیز روزہ دار ہو۔ مطلب
یہ ہے کہ کان اُن آوازوں سے علیحدہ ہیں جن کا سننا شرع نے حرام
قرار دیا ہے۔ نگاہ ان مناظر کو دیکھنے سے الگ رہے جن کا دیکھنا
ممنوع ہے۔ جسم کی کھال ایسے اشیاء کو مس کرنے سے جدا رہے جن
کا چھونا ناجائز ہے۔ اسی طرح اور اعضائے جسم قیود وحدود کے پابند
رہیں۔ زیادہ صاف الفاظ میں "تمہارے روزہ کا دن بے روزہ
والے دن کے مثل نہ ہو ... "جب روزہ رکھو

تو زبانوں کو اپنی روکے رکھو، نگاہوں کو باز رکھو۔ آپس میں جھگڑا نہ
کرو اور نہ باہم ایک دوسرے پر رشک وحسد کرو۔"

خصوصیت کے ساتھ اس کی ہدایت ہوئی ہے کہ روزہ کی حالت
میں خدمت گاروں پر سختی نہ کرو۔ پیغمبر خدا نے ایک خاتون کو د
کہ وہ روزہ کی حالت میں اپنی کنیز کو گالیاں دے رہی تھی۔ حضر
نے ان کے لئے کھانا لاؤ۔ اس خاتون نے کہا میں روزہ سے
آپنے فرمایا۔ تم کیسی روزہ سے ہو کہ اپنی لونڈی کو گالیاں دیتی ہو۔
رکھو کہ روزہ فقط کھانے پینے کے چھوڑنے کا نام نہیں ہے" بلکہ روز
میں یہ حکم ہے کہ غصہ کی بات بھی ہو تو ٹال دو اور کہو کہ میں روزہ
ہوں اس لئے غصہ نہیں کروں گا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا
اگر کوئی اس کے مقابلہ میں جہالت سے بھی کام لے تو یہ برداشت
کرلے۔

دو حدیثیں اس مضمون کی ہیں "جب روزہ دار اللہ
بندے کو گالیاں دی جائیں اور وہ کہے کہ اللہ تمہارا بھلا کرے
تمھیں اس طرح کے الفاظ نہ کہوں گا جیسے تم نے مجھے کہے تو پروردگا
عالم فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے دوسرے شخص کی شرارت سے
میں میرے روزہ کی پناہ لی ہے۔ اب میں اس کو اپنے عذاب سے پناہ د
اسے بہشت میں داخل کیا جائے۔

اعتکاف

نیت کے ساتھ

…رنے کو اعتکاف کہتے ہیں۔ یہ ہر زمانہ میں مستحب ہے اور خصوصیت کے ساتھ ماہ رمضان کے آخری دس دنوں میں اس کا بہت ثواب ہے۔

اعتکاف کے لئے ضروری ہے کہ شہر کی مسجد جامع میں ہو اس عرصہ میں اس کو مسجد سے نکلنا جائز نہیں ہے مگر کسی ضرورت خاص یا کسی ایسے امر مستحب کیلئے جو بغیر مسجد سے باہر نکلے ہوئے انجام نہیں پا سکتا جیسے تشییع جنازہ یا کسی برادر مومن کی حاجت براری کرنا۔ اور جب نکلے تو کسی سایہ دار جگہ پر نہ بیٹھے اور مسجد سے باہر نماز نہ پڑھے۔ دو دن تک روزہ اعتکاف کا توڑنا باختیار جائز ہے لیکن تیسرے دن اعتکاف واجب ہو جاتا ہے اور اگر اعتکاف نذر وغیرہ کی وجہ سے واجب تھا خاص اسی زمانہ میں تو پہلے اور دوسرے دن بھی اس کا توڑنا جائز نہ ہوگا۔

حالت اعتکاف میں عورت سے جنسی تعلقات قائم کرنا (یہاں تک کہ رات کو بھی) اس کے علاوہ خرید و فروخت، کسی ذاتی بنیاد پر کسی سے بحث و تکرار کرنا، خوشبو سونگھنا سب ناجائز ہیں۔

یہ تمام صورتیں ضبط نفس کی صفت پیدا کرنے کی ہیں جو عدل و اعتدال پر قائم رہنے کا اصل سرچشمہ ہے۔

---

(۳) زکوٰۃ

ارکان اسلام میں زکوٰۃ نہ اہم رکن ہے جس کا قرآن کریم میں اکثر جگہ صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے، صلوٰۃ ان عبادات کا سرنامہ ہے جو اعضاء و جوارح سے متعلق ہیں اور زکوٰۃ ان عبادات کا جو اموال سے متعلق ہیں۔

زکوٰۃ کے معنی

لغت میں اس لفظ کے دو معنی ہیں (۱) پاکیزگی (۲) زیادتی شریعت اسلام میں زکوٰۃ ایک خاص مقدار مال ہے جس کا مخصوص شرائط کی صورت میں مالک کو اپنے اموال میں سے نکال کر مستحقین تک پہنچانا ضروری ہوتا ہے اس کے نکالنے سے وہ مال پاک وصاف ہو جاتا ہے اور خدا اس کے سبب سے اور زیادتی عطا فرماتا ہے۔

شخصی ملکیت

قانون اسلام میں زکوٰۃ کا وجود اس کی دلیل ہے کہ اسلام شخصی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے اور نیز یہ کہ اس کے یہاں ورع اور تقویٰ کا معیار یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص روپیہ کو ہاتھ ہی نہ لگائے اور اموال حاصل ہی نہ کرے، بلکہ تقوے کا معیار یہ ہے کہ وہ اُن فرائض کو ادا کرتا ہے جو اموال فراہم ہونے

ان فرائض میں بڑا اہم فرض زکوٰۃ کا ہے،

وہ اشیاء جن میں زکوٰۃ واجب ہے

زکوٰۃ تین قسم کی چیزوں میں ہوتی ہے
ایک نقدی دوسرے مویشی تیسرے غلہ
ان میں سے ہر ایک میں زکوٰۃ کے شرائط الگ الگ ہیں۔
نقد روپیہ میں اس وقت زکوٰۃ ہوتی ہے۔ جب وہ سونے اور چاندی کے سکوں کی صورت میں ہو اور ایک سال تک یعنی گیارہ مہینے پورے ہو کر بارھویں مہینے کے شروع تک وہ بلا تغیر و تبدل رکھا رہے۔

سونے کی اشرفیوں کا نصاب یعنی وہ مقدار جس سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے وزن کے اعتبار سے پانچ تولے ساڑھے سات ماشے ہے تولہ بارہ ماشہ کا اور ماشہ آٹھ رتی کا۔ جب اتنی مقدار میں اشرفیاں ہوں اور سال بھر رکھیں تو ان میں چالیسواں حصہ واجب الادا ہوگا۔ پھر اگر اتنی اشرفیوں سے ایک تولہ ڈیڑھ ماشہ زائد ہو تو اس میں بھی چالیسواں حصہ ہوگا اسی حساب سے جس قدر اشرفیاں زائد ہوں سب کا حساب کر کے کل کا چالیسواں حصہ واجب الادا ہوگا۔ البتہ اگر آخری حصہ ایک تولہ ڈیڑھ ماشہ سے کم بچے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وزن میں اکتالیس روپے ایک ماشہ کے برابر ہے۔ روپیہ ساڑھے گیارہ ماشہ کے حساب سے لگایا گیا ہے اس میں چالیسواں حصہ واجب الادا ہوگا، پھر جب ان روپوں پر آٹھ روپے بھر اور ڈھائی ماشہ کا اضافہ ہو تو اس میں بھی چالیسواں حصہ واجب ہوگا۔ اس کے بعد جتنے روپے زائد ہوں ان کو اسی حساب سے لگایا جائے گا ہاں آخر میں آٹھ روپے بھر اور ڈھائی ماشہ سے کم جو روپے فاضل ہوں ان میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

مویشی۔ تین قسم کے جانوروں میں زکوٰۃ واجب ہے۔

(۱) اونٹ

(۲) گائے بیل

(۳) بھیڑ بکریاں

ان تینوں میں یہ شرط ہے کہ اس شخص کی ملکیت میں ان پر ایک سال گذر جائے اور تمام سال گھر میں رکھ کر ان کو نہ کھلایا گیا ہو بلکہ چرائی پر چرتے ہوں اور بار برداری یا ایسے کسی دوسرے کاموں میں صرف نہ ہوتے ہوں۔

اونٹوں میں کم از کم نصاب پانچ کا ہے، پانچ اونٹوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے، جب پانچ اونٹ ہوں تو ایک بکری دینا ہوگی۔ دس ہوں تو دو بکریاں۔ پندرہ میں تین بکریاں [illegible] میں چار بکریاں [illegible] کی صورت میں پانچ بکریاں

اگر چھبیس ۲۶ اونٹ ہوں تو پھر ایک ایسی اونٹنی دینا لازم ہوگی
جس کی عمر ایک سال سے زیادہ اور دو سال سے کم ہو۔ اگر
چھتیس ۳۶ ہوں تو ایک ایسی اونٹنی دینا واجب ہوگی جس کی عمر دو سال
سے زیادہ تین سال سے کم ہو۔ چھیالیس ۴۶ میں ایسی جس کی عمر
تین سال سے زیادہ اور چار سال سے کم۔ اکسٹھ ۶۱ میں ایسی اونٹنی
جو چار اور پانچ کے درمیان۔ چھہتر ۷۶ میں دو اور تین سال کے درمیان
کی دو اونٹنیاں۔ اکانوے ۹۱ میں تین اور چار کے درمیان کی دو۔
ایک سو اکیس ۱۲۱ یا اس سے زیادہ کی تعداد ہو تو پھر ہر پچاس کے
حساب سے ایک ایک تین اور چار سال کے درمیان والی
اونٹنی یا ہر چالیس کے حساب سے ایک ایک دو اور تین سال کے درمیان
والی۔ یہ تعداد کی نوعیت کے لحاظ سے ہے۔ اگر گنتی پچاس سے
پوری ہوتی ہو تو اس کا حساب ہوگا اور اگر چالیس ۴۰ سے حساب پورا
اترتا ہو تو اس کا اعتبار ہوگا۔ اور اگر دونوں حساب ٹھیک بیٹھتے
ہوں یا بہر صورت کچھ فاضل بچ جاتا ہو، پوری طرح حساب تقسیم
نہ ہوتا ہو تو اختیار ہوگا چاہے پچاس ۵۰ سے حساب لگائے یا چالیس ۴۰ سے
اور جو فاضل مقدار ہوگی وہ معاف ہوگی۔

گائے بیل میں دو ۲ نصاب ہیں۔ پہلے تیس ۳۰ اس میں ایک
گائے یا بیل ایسا دینا ہوگا جس کی عمر ایک سال سے زیادہ اور دو ۲
سال سے کم ہو۔

دوسرے چالیس ۴۰ اس میں ایک ایسی گائے دینا ہوگی جو

دو سو اور تین سو کے درمیان ہو اس سے زیادہ اگر ہو تو پھر اسی تیس اور چالیس کے حساب ہوگا یعنی جہاں تیس سے پورا ہو وہاں تیس سے اور جہاں چالیس سے پورا ہو وہاں چالیس سے اور جہاں دونوں یکساں ہوں وہاں اختیار ہے۔

بھیڑ بکری میں اگر چالیس ہوں تو ایک بکری اور ایک سو اکیس ۱۲۱ ہوں تو دو بکریاں اور دو سو ایک میں تین اور تین سو ایک میں چار۔ چار سو یا اس سے زیادہ میں فی صدی ایک بکری اور سو سے کم جو فاضل بچے وہ معاف

غلہ :- کھانے کی چیزوں میں چار قسم کی زکوٰۃ ہے۔

(۱) گیہوں

(۲) جو

(۳) خرما

(۴) منقے

زکوٰۃ کا تعلق ان چیزوں سے اُس وقت ہوتا ہے جب زمین سے پیدا ہونے کے بعد مذکورہ چیزوں کا نام صادق آنے لگے یعنی اُسے گیہوں، جو یا خرما کہنے لگیں، اور منقے میں انگور کا نام صادق آنے لگے۔

زکوٰۃ کے وجوب میں یہ شرط ہے کہ اس وقت جب زکوٰۃ کا تعلق ہوتا ہے وہ اس کی ملک میں ہوں خواہ اُس نے خود اُن کو بویا ہو یا وہ کھیتی خرید لی ہو [illegible] کی جانب منتقل

ہوئی ہو لیکن اگر تعلق زکوٰۃ کے بعد اس کی طرف انتقال ہوا ہو تو
اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

نصاب زکوٰۃ کا ان میں تین سَو صاع شرعی یعنی قدیم لکھنؤ
کے سیر سے جو چھیانوے روپے کا گیارہ ماشہ کے روپے ہوتا
تھا تخمیناً اٹھارہ من تیس سیر ہوئے۔ اس سے کم اگر ہو تو اس میں
زکوٰۃ واجب نہیں ہے لیکن اگر اس نصاب سے زیادہ ہو تو اس
زیادتی میں بھی وہ چاہے جتنی ہو زکوٰۃ دینا ہوگی۔

اگر کھیتی ایسی ہے جو آب باراں سے سیراب ہوتی ہے یا نہر و
دریا کے کنارے ہونے کی وجہ سے خود اس کی رگیں رطوبت کو
جذب کر کے سیراب ہوتی ہیں اور سینچنے کی ضرورت نہیں ہے یا نہر
اور دریا سے نالیوں کے ذریعہ سے پانی اس تک پہونچا دیا جاتا ہے
مگر نہر و دریا سے پانی نکال کر ان نالیوں تک پہونچانے کے لئے
کسی آلہ اور مشین کی ضرورت نہیں ہے تو ان صورتوں میں دسواں
حصہ دینا لازم ہوگا اور اگر وہ زراعت ایسی ہو کہ ڈولوں سے
سینچنے یا کسی اور آلہ سے سیراب کی جاتی ہے تو اس صورت
میں بیسواں حصہ دینا ہوگا۔ اور اگر وہ زراعت دونوں صورتوں
سے سیراب ہوتی ہے تو یہ دیکھا جائیگا کہ زیادہ تر اس میں کس طریقہ
سے سینچائی ہوتی ہے۔ جو زیادہ ہوتا ہو اُس کا لحاظ ہوگا اور اگر
دونوں صورتیں برابر ہوں تو نصف زکوٰۃ دسویں حصہ کے اعتبار
سے اور نصف بیسویں کے اعتبار سے دینا ہوگی اور یہ دسواں یا

بیسواں حصہ مخارج منہا کرنے کے بعد نکالا جائیگا۔

تعلق زکوٰۃ کے قبل اگر وہ زراعت تلف ہو جائے یا اس شخص کی ملک سے خارج ہو جائے تو زکوٰۃ کا حکم اس پر نہ ہوگا۔

مستحقین

جن مدوں میں زکوٰۃ کو صرف کیا جانا چاہیئے وہ حسب ذیل ہیں

(۱) فقراء و مساکین یعنی ایسے لوگ جن کے پاس اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے ایک سال کے کھانے کا سہارا نہیں ہے، خواہ نقد روپئے کی صورت میں اور خواہ ایسا کوئی پیشہ جو سال بھر تک ان کی بسر اوقات کے لئے کافی ہے۔ اس ذیل میں ایسے اشخاص جو دست سوال دراز نہیں کرتے مگر اس معیار پر پورے اترتے ہیں زیادہ قابل ترجیح ہیں۔

(۲) ایسے مقروض جو قرضہ ادا نہ کر سکتے ہوں، اس صنف کو فقراء و مساکین سے الگ قرار دیئے جانے ہی سے ظاہر ہے کہ اس مد میں فقیری و مسکینی کا اعتبار نہیں ہے یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے اور اپنے متعلقین کی کفالت سے تو سال بھر کے لئے مطمئن ہے، مگر اس کے علاوہ اتنا اس کے پاس نہیں ہے کہ قرضہ ادا کر سکے تو ایسے شخص کو قرض کے بارے سبکدوش کرنے کیلئے زکوٰۃ سے دیا جا سکتا ہے مگر یہ شرط ضروری ہے کہ وہ قرضہ کسی امر نامشروع کے سلسلے میں نہ ہو، فضول تقریبات اور شادی وغیرہ

کا دھوم دھڑکا بھی جو اپنی حیثیت سے زیادہ ہو اس کے تحت میں داخل ہے ایسوں کو دیکر اس مشغلہ کی ہمت افزائی درست نہیں ہے۔

ہاں اگر معلوم ہو کہ یہ واقعی نادم ہیں اور آئندہ ایسا نہ کریں گے تو اس صورت میں ان کی امداد صحیح ہوگی۔

(۳) ایسے مسافر جو پردیس میں ضرورت مند ہوں، چاہے اپنے وطن میں وہ صاحب حیثیت کیوں نہ ہوں۔ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ سفر نا مشروع نہ ہو

(۴) مؤلفت القلوب یعنی ایسے اشخاص جنھیں دیکر دین و مذہب کیلئے کچھ مفید خدمات حاصل کیئے جا سکیں۔

(۵) ہر ایسے امر میں جو رضائے الٰہی کا باعث ہو۔ رفاہ عام کے تمام کام اس کے تحت میں داخل ہیں خواہ وہ عام نفع کا کام ہو جیسے مسجد، مدرسہ وغیرہ، یا خاص ہو جیسے کسی حاجی یا زائر کی جو خود حج و زیارت پر قادر نہ ہو اس مقصد میں اعانت کرنا یا کسی طالب علم کی پرورش۔

(۶) زکوٰۃ کے کارندے یعنی وہ نظام حکومت شرعی جو زکوٰۃ کے حاصل کرنے کے لئے قائم کیا جائے، اس میں جن لوگوں سے بانتخواہ کام لیا ہو وہ تنخواہ بھی اسی فنڈ سے دی جائیگی۔

مستحقین زکوٰۃ میں صاحب ایمان یعنی صحیح العقیدہ مسلمان ہونے کی شرط ہے مگر رفاہ عام کے کام بلا تخصیص فرقہ و مذہب انجام دیئے جا سکتے ہیں، ان میں یہ خصوصیت مدنظر نہیں رکھی جائیگی

کہ کون لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، نیز مؤلفۃ القلوب کی حیثیت سے جن کو دیا جائے گا ان میں بھی ظاہر ہے کہ ایمان کی شرط کا لحاظ نہیں ہے۔

غیر سادات کی زکوٰۃ کا سادات کو دیا جانا درست نہیں ہے، اس کے بالمقابل سادات کے لئے خمس قرار دیا گیا ہے، جس کا بیان بعد میں ہوگا۔

ایسے اشخاص کو بھی زکوٰۃ دینا جائز نہیں جن کا نان ونفقہ خود اس کے زکوٰۃ دینے والے پر واجب ہے، ہاں دوسرے اعزا جو واجب النفقہ نہیں ہے، درصورتیکہ شرائط زکوٰۃ کے حامل ہوں ان کی مدد زکوٰۃ سے کی جاسکتی ہے۔

مستحقین کو یہ کہکر دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ زکوٰۃ ہے بلکہ اگر ایسے خود دار اشخاص ہوں جو اس نام سے نہیں لیں گے تو کسی دوسرے موزوں طریقہ سے اُن تک اس مال کا پہونچا دینا کافی ہے صرف قصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس ذریعہ سے زکوٰۃ ادا کر رہا ہے۔

زکوٰۃ کو اُن تمام قسم کے لوگوں پر تقسیم کرنا واجب نہیں ہے بلکہ کسی ایک شخص کو اتنا دیا جاسکتا ہے جتنے میں وہ شرعی اصطلاح کے مطابق غنی ہو جائے، یعنی سال بھر کے کھانے کا سہارا اسے ہو جائے اس سے زیادہ دینا پھر جائز نہ ہوگا۔

نظام زکوٰۃ پر ایک تبصرہ

شریعتِ اسلام میں زکوٰۃ مثل نماز کے ایک فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے جس میں دینے والے کا قصد و ارادہ اور مرضیٔ الٰہی کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔

جبری حیثیت اور حکومت کے تشدد سے جو عمل انجام دیا جائے اُس سے ذہنیت کی تعمیر اور احساس کی بیداری پیدا نہیں ہو سکتی اور ایسا نظام جو جبر و تشدد کے سہارے پر قائم ہو کوئی مستحکم حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ جبر و تشدد کا اثر قوت و طاقت کے ساتھ وابستہ ہے اِدھر سلطنت کے آہنین پنجہ کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور نظام میں ابتری ہوئی۔ اسلامی نظام کی تشکیل میں موعظہ و ارشاد اور دعوت و تبلیغ جتنی مؤثر ہوتی ہے تازیانہ اور تلوار نہیں۔ اسی لئے زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے کسی جاسوسی نظام اور مخبری کے محکمہ کا تشکیل کرنا بھی درست نہیں ہوگا بلکہ جیسا جناب امیرؑ علیہ السّلام نے نہج البلاغہ میں مندرج شدہ ایک ہدایت نامہ میں اپنے اعمّال کو تحریر فرمایا ہے، زکوٰۃ کے وصول کرنے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خود صاحبان اموال سے جا کر دریافت کریں کہ تمھارے پاس ان شرائط کے مطابق جن میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے مال ہے یا نہیں ہے۔ اگر وہ انکار کر دیں تو اُن سے کسی تعرض کی ضرورت نہیں ہے۔ جب وہ خود اقرار کریں کہ ہاں ہمارے ذمہ حقوق الٰہی واجب الادا ہیں تو جو حساب وہ بتائیں اس کے مطابق ان سے وصول کیا جائے۔

افسوس ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد دنیا اس صحیح نظام کے تجربوں سے اکثر و بیشتر روشناس ہی نہ ہو سکی۔ اس لئے اب ہم اس نظام کے فیوض و برکات کو عالم مشاہدہ میں نہیں دکھا سکتے مگر دنیا کے عام رجحانات اب چودہ سو برس کے ارتقاء کے بعد یہ محسوس کر رہے ہیں کہ انسان کے ضمیر کو خود اس پر حاکم بنانا جبر و تشدد کے سہارے سے زیادہ موثر اور کامیاب ہو سکتا ہے۔ اب ایسے تجربے کئے جا رہے ہیں اور بعض جگہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں کہ جیلوں میں کوئی بندش نہ ہو، امتحانوں میں نگرانی کا شکنجہ نہ ہو اور اس طرح مختلف شعبوں میں خود انسانوں کو شایان شان اور موزوں کردار کے باختیار خود حاصل کرنے کی دعوت دی جائے اس دور تہذیب و تمدن میں ابھی یہ تجربے بالکل ابتدائی منزل میں ہیں مگر قرآن نے چودہ ۱۴ سو برس پہلے لا اکراہ فی الدین کی آواز بلند کر کے اور پیغمبر اسلامؐ نے اپنی سیرت سے اس کی مثال پیش کر کے اور حضرت علی بن ابیطالبؑ نے زکوٰۃ کے بارے میں مذکورہ بالا دستور العمل کو پیش کر کے نوع انسانی کو اس نفسیاتی اصلاح کے نظام سے روشناس بنایا۔

احکام زکوٰۃ کی روشنی میں اقتصادی نظام

اگر کوئی نظام حکومت آئین اسلام کے مطابق قائم ہو تو زکوٰۃ و خمس کے احکام میں ایسے امکانات ہیں کہ ایک وقت میں قوم کے اندر کوئی فرد اپنے آزوقہ سے غیر مطمئن باقی نہ رہے۔

خمس کے ایسے احکام کا بیان تو بعد میں ہوگا۔ زکوٰۃ کے جو احکام بیان ہو چکے ان کے لحاظ سے قوم کی کوئی فرد دو حال سے خالی نہیں ہے یا وہ غنی ہے یا فقیر۔ اصطلاح شرع میں غنی اور فقیر کی جو تعریف ہے اس کے لحاظ سے ان دونوں سے خارج کوئی ایک شخص بھی نہیں ہو سکتا۔ سال بھر کے کھانے سے مطمئن ہے یا نہیں ؟ اب اس میں تیسری شق ہو ہی کیا سکتی ہے۔

پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جن پر دوسرے شرائط کی موجودگی میں زکوٰۃ کا ادا کرنا لازم ہوتا ہے اور دوسری قسم کے وہ جنھیں زکوٰۃ کا لینا جائز ہوتا ہے اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ زکوٰۃ میں ہر مستحق کو اتنا دیا جا سکتا ہے جس سے وہ غنی کی تعریف میں داخل ہو جائے اس لئے اگر حکومت کی طرف سے تمام افراد ملت کی مردم شماری ان کے ذرائع معیشت کی تفصیلات کے ساتھ مرتب کی جائے جس سے یہ ظاہر ہو کہ کتنے وہ ہیں جن پر زکوٰۃ کا فریضہ عائد ہوتا ہے اور کتنے وہ ہیں جو زکوٰۃ کے مستحقین میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد زکوٰۃ کی جمع آوری کا انتظام کیا جائے ایک مرکز میں جسے "بیت المال" سمجھا جانا چاہیئے اور اس مجموعی مقدار کے لحاظ سے منصوبہ بنایا جائے کہ اس سال اتنوں کو اتنی اتنی مقدار دے کر غنی بنا دیا جائے گا۔ یہ اس گنجائش کے اعتبار سے ہوگا جو اس سال کے جمع شدہ فنڈ میں عمال زکوٰۃ وغیرہ کی تنخواہیں دینے کے بعد بچ رہی ہے۔

کرا دی جائیں جس سے ایک سال کے آزوقہ میں اُن کے جو کمی ہوتی ہے وہ پوری ہو جائے اس طرح اتنے افراد اب اغنیاء کی فہرست میں داخل ہو جائیں گے اور ان میں سے بعض ایسے ہوں گے جو دوسرے شرائط کی فراہمی کے لحاظ سے خود دوسرے سال زکوٰۃ دینے والے افراد میں مندرج ہو جائیں گے اس طرح دوسرے سال اس فنڈ کی قوت امداد میں اتنا اضافہ ہو گا کہ وہ پہلے سال سے زیادہ افراد کی امداد کر کے اُن کو فقیری کی سطح سے اونچا کر سکے۔
اس طرح منطقی طور پر لازماً ایک وہ وقت آئے گا کہ افراد قوم میں سے کوئی فرد مستحق زکوٰۃ ہونے کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو اور کوئی شخص سوا اتفاقی حوادث کے جیسے مسافر ہونے کی بنا پر صاحب حاجت ہو جائے یا کسی آفت ارضی و سماوی سے اس کا ذریعہ معیشت مفقود ہو جائے۔ ایسا نہ رہیگا جس کی زکوٰۃ سے امداد ضروری ہو تو پھر اجتماعی ضروریات قوم کی فہرست مرتب کی جائے مثلاً کتنے شفاخانوں کی ضرورت ہے۔ کتنے مدارس کی ضرورت ہے دار العجزہ کے قیام کی ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ اور اہم فالاہم کے اصول پر ان کی تکمیل ہوتی رہے۔
ہمیں یقین ہے کہ حضرت پیغمبر خداؐ کے بعد اگر صحیح اسلامی نظام کارفرما رہتا تو اس وقت مسلمانوں میں فقیر و مسکین کا پتہ نہ ملتا۔ نہ خیراتی یتیم خانوں کی ضرورت ہوتی اور نہ مدارس وغیرہ کے لیے بار بار افراد قوم سے چندے مانگنے کی ضرورت ہوتی۔ تمام ضروریات

اسی اسلامی نظام ہی سے پورے ہو جاتے۔ مگر افسوس ہے کہ پیغمبر خدا کے بعد خود مسلمانوں میں جاہلی سرمایہ داری کا قیام ہو گیا اور اسلامی تعلیم پر عمل ترک کر دیا گیا۔

اب بھی جب صحیح اسلامی نظام قائم ہو گا تو اُس کا معیاری نتیجہ آخر میں یہی ہو گا جسے امام آخرالزماںؑ کے ظہور کے حالات میں حدیثوں نے بتایا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والوں کو مستحق کی تلاش ہو گی اور مستحق ڈھونڈھے سے نہ مل رہا ہو گا۔

یہ ہے کامیاب نظام معیشت جو اسلامی تعلیمات کے زیر سایہ ہی قائم ہو سکتا ہے۔

۱۴۔ خمس

خمس کی اسلامی اہمیت

اسلام کے عملی ارکان میں خمس بھی مثل نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ کے وہ اہم فریضہ ہے جس کا بالتصریح قرآن مجید میں حکم موجود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

واعلموا انما غنمتم من شیٔ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمسٰکین وابن السبیل ان کنتم اٰمنتم باللہ (سورہ انفال)

"جو کچھ تمہیں بطور غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ اللہ کا ہے۔ اور رسولؐ کا، اور صاحبانِ قرابت کا، اور یتیموں کا، اور مسکینوں کا، اور مسافروں۔ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو"

لغوی اعتبار سے تو اس آیت کے مفہوم میں بڑی وسعت تھی کیونکہ ماغنمتم کے معنی ہیں "جو تمہیں فائدہ حاصل ہو" اب وہ کسی بھی ذریعہ اور کسی صورت سے بھی ہو لیکن قرآن کے اجمال کی تفصیل عموم کی تخصیص اور اطلاق کی تقئید ان رہنمایان دین کے ارشادات سے ہو جایا کرتی ہے جنھیں اس کام کی انجام دہی کے لئے قرآن مجید کے ساتھ رکھا گیا اور ایک طرف خود قرآن نے پیغمبرؐ کا کام یہ بتایا تاکہ وہ قرآن کی آیات کی [illegible] تعلیم کی

دیں (یتلوا علیھم ایتہ ویعلمھم الکتب) اور ان تمام تشریحات کا بتانا ہی ایک معلم کا فریضہ ہے دوسری طرف حضرت نے اپنے بعد کے لیے یہ اعلان فرمایا کہ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی "میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ اللہ کی کتاب اور میرے مخصوص قرابتدار اور میرے اہل بیت"

چنانچہ ان کے تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے مال ومتاع میں خمس نہیں ہے۔ بلکہ وہ چند قسم کا مخصوص حاصل شدہ مال ہوتا ہے جس میں خمس ہوتا ہے۔

ان اقسام کی تفصیل بعد میں درج کیجائے گی۔

خمس کے حصے

قرآن کی آیت میں صاف صاف مال خمس کے چھ حصے مذکور ہیں: (۱) اللہ (۲) رسول (۳) ذوالقربیٰ

تمام علمائے اسلام متفق ہیں کہ اس سے رسالت مآب کے قرابتدار مراد ہیں۔ جن پر زکوٰۃ کو حرام قرار دیا گیا تھا اور خمس میں ان کا حق رکھا گیا تھا۔

(۴) یتامیٰ (۵) مساکین (۶) ابناء السبیل یعنی مسافرین۔

ظاہر ہے کہ تمام مسلمان قرآن کو تو اسلامی قانون اور اس کی تعلیم کو بڑی تعلیم مانتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ لگاتے ہیں وہ بھی ... احکام کو تو ناقابل ترمیم ہونے کا اقرار کر ... بعد

رسولؐ جب سیاست کی ہوا اہلبیت رسولؐ کے خلاف چلی تو یہ عبرت انگیز واقعہ ہے کہ اس بارے میں قرآنی فریضہ میں بھی ترمیم کر دی گئی۔ اول تو عموماً اہل سنت خمس کے فریضہ کی اہمیت سے بے خبر ہوگئے اور جیسے زکوٰۃ کو لازمی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس طرح خمس سے وہ متعارف نہیں ہیں البتہ فقہاء و علماء جو کتابوں میں چار و ناچار اس کا تذکرہ کر دیتے ہیں تو وہ بھی طرح طرح سے اس میں ترمیمیں کر کے مثلاً امام مالک کا قول ہے کہ خمس حکومت صوابدید سے وابستہ ہے وہ جس طرح چاہے صرف کرے۔ ابو حنیفہ کا فتویٰ ہے کہ خمس کے تین حصے ہوں گے۔ ایک یتیموں کا ہو گا اور ایک مساکین کا اور ایک ابناء السبیل کا اور اس میں سادات اور غیر سادات کا کوئی فرق نہیں ہے۔

یہ عبرت خیز اجتہادات بتا رہے ہیں کہ عام مسلمانوں نے عترت و اہل بیت کو نظر انداز کرنا اتنا ضروری سمجھا کہ اگر قرآن بھی ان کے حق میں آجائے تو قرآن کو صاف صاف نظر انداز کرنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہ کی جائے گی۔

یہ بھی مسلم حیثیت سے ثابت ہے کہ حضرت پیغمبر خداؐ برابر اس آیت کے مضمون پر عمل فرماتے رہے۔ آپ ایک حصہ اپنا رکھتے تھے اور ایک حصہ اپنے قرابتداروں کا رکھتے تھے۔ یہ آپ کا عمل برابر جاری رہا۔ مگر جب خلیفہ اول مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو انھوں نے رسولؐ اور اقربائے رسولؐ کا حصہ قطع کر کے بنی ہاشم کو خمس سے محروم کر دیا اس کا ذکر تفاسیر و صحاح اہل سنت میں موجود ہے۔

شیعہ تعلیم قرآن کے مطابق خمس کو فریضہ لازم جانتے ہیں اور اس میں اتنے ہی حصّے تسلیم کرتے جتنے قرآن مجید نے بتائے ہیں۔

حکمِ خمس کی اہمیّت

احادیث سے خمس کی بڑی اہمیت ثابت ہوتی ہے خمس کے روکنے والے پر لعنت ہوئی ہے۔ اور اس کا حقوق اہل بیت کے غاصبین میں شمار کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ خمس ادا کئے بغیر جس مال سے کوئی شے خریدی جائے، اس شے میں تصرفات بھی ناجائز بتائے گئے ہیں۔

اس ذیل میں جناب تاج العلماء طاب ثراہ کے دستخطی ایک اردو زبان کے رسالہ خمس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے، جس سے نہایت موثر انداز میں خمس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

"غور کرنا چاہیے کہ ان حضرات نے ہماری ہدایت کے لئے کیسی کیسی مشقتیں جھیلیں اور کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں۔ اپنے اپنے وطن چھوڑے، اپنے اپنے قریب عزیزوں سے منھ موڑے، نئے نئے دیار بسائے، راہ خدا میں اپنے خون کے فوارے بہائے۔ پھر حیف کی بات ہے کہ ہم ان کے کہلائیں اور اُن کی اولاد کے حق سے جو خدا کی طرف سے لازم الادا ہے وقت پر اپنے منھ چھپائیں اور جزا سا حق ان کا دبا رکھیں اور ان کی دوستی کا دم بھر کے پھر پیروی کرجائیں ان کے دشمنوں کی کہ جن محسن کشوں نے سب ان کے احسانات گنوائے بیشکر گزاری کے بدلے

اُن کی قلیل سی وجہ معاش چھین لی ۔ الغرض خمس کا سادات سے روکنا اُن ہی ظالموں کی پیروی ہے ۔

مرمرا باور نمی آید زروئے اعتقاد
حقِ زہرا خوردن و دینِ پیمبر داشتن

خمس کن چیزوں میں واجب ہے؟

خمس سات قسم کے اموال میں واجب ہے :-

ا ۔ اموالِ غنیمت ، یعنی وہ اموال جو جہادِ شرعی میں غیر مسلمین سے حاصل ہوں ، موجودہ زمانہ میں جبکہ شرعی جہاد کے شرائط عموماً حاصل نہیں ہیں ۔ اس میں وہ اموال داخل ہوں گے جو قانونِ حکومت اور عرفِ عام کے معیارِ اخلاق پر آئینی طور سے غیر مسلمین سے حاصل کیے گئے ہوں مگر آئینِ اسلام کے معیار پر صحیح نہ اترتے ہوں تو خمس دے کر وہ پاک و حلال ہو جائیں گے جیسے بنک اور ڈاکخانہ وغیرہ کا سود یا انشورنس سے جو مال بلا استحقاق شرعی حاصل ہو ، وغیرہ وغیرہ ، مگر ایسے ذرائع سے جو عمومی معیارِ اخلاق کے خلاف ہوں ، جیسے چوری ، مکاری اور خیانت غیر مسلمین سے بھی اموال کا حاصل کرنا اور مسلمانوں کے دامنِ اخلاق کو داغدار بنانا جائز نہیں ہے ۔ اور مسلمانوں سے ایسے قانونی طریقہ سے بھی حاصل کرنا جائز نہیں ہے ۔ جو شریعت اسلام میں صحیح بنا نہ گیا ہو ۔ اس لئے ممالکِ اسلامیہ کے مسلمانوں کو بنک اور ڈاکخانہ وغیرہ کے سود سے بھی پرہیز لازم ہے ۔

۲ ۔ معادن ، یعنی زمین کے اندر پیدا ہونے والی چیزیں جیسے سونا چاندی

تانبا، سیسہ، یاقوت و زبرجد ہیرے، نمک، گچ، فیروزہ وغیرہ۔ بلکہ سیّال چیزیں جو زمین میں پائی جاتی ہیں وہ بھی اسی میں داخل ہیں جیسے مٹی کا تیل، گندھک یا سوئی گیس جو پاکستان میں برآمد ہوا ہے۔

یہ تمام اگر کسی ایسی زمین میں ہوں جو کسی شخص خاص کی ملک میں نہیں ہے تو وہ بھی کسی کی ملکیت نہ ہوں گے۔ بے شک جو اسے برآمد کرے وہ جتنا اس میں سے نکالے وہ اس کی ملکیت ہوگا اور اس پر خمس واجب ہوگا۔ اور اگر اتفاق سے کسی ایسی زمین میں نکلیں جو کسی شخص خاص کی ملک ہے تو شرعاً وہ معدن بھی اس شخص کی ملک قرار پائے گا اور اب وہ جتنا بھی اس میں سے حاصل کرے اس کا خمس ادا کرے۔

۳۔ خزانہ یعنی وہ مال جو کسی نے زمین کے اندر کبھی رکھ دیا تھا اور اس کے متعلق آثار و قرائن کے لحاظ سے یہ حکم نہ لگایا جا سکے کہ وہ کسی مسلمان کا رکھا ہوا ہے تو وہ خزانہ پانے والے کے لیے جائز و مباح ہے بشرطیکہ وہ اس میں سے خمس نکال دے۔ لیکن اگر وہ خزانہ ایسی زمین میں ہو جس میں آثار و قرائن کی بنا پر یہ سمجھا جا سکے کہ وہ ضرور کسی مسلمان کی ملکیت ہے تو اس کا حکم وہ ہوگا جو زمین پر پڑی ہوئی کسی چیز کا ہوتا ہے۔ جسے کوئی اٹھا لے۔ جسے لقطہ کہتے ہیں۔ اس کے لئے اعلان و اشتہار دینا اور مالک کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ اور جب پتہ نہ لگے، تو پھر یا تو اسے مالک کی طرف سے بطور امانت اپنے قبضہ میں رکھے یا اسی کی طرف سے امور خیر میں صرف کر دے

لیکن اس قصد سے کہ اگر مالک کبھی مل گیا اور ان مصارف پر رضامند نہ ہوا تو یہ اس کا معاوضہ ادا کرے گا۔

۴ - غوطہ زنی سے برآمد کی جانے والی چیزیں جیسے موتی، مونگا وغیرہ اور عنبر کو اگر دریا کے اندر سے نکالا جائے تو وہ اسی قسم میں داخل ہے اور اگر دریا کے کنارے سے یا پانی کے اوپر سے حاصل کیا ہو تو وہ حکم معادن میں داخل ہے۔ بہرصورت خمس اس میں واجب ہے۔

۵ - تجارت اور دوسرے پیشوں میں حاصل شدہ منافع میں سے سال بھر کے مصارف کے بعد جو بچت ہو۔

مصارف میں تمام جائز خرچ داخل ہوں گے چاہے ضروریات حیات میں داخل نہ ہوں۔

۶ - وہ زمین جس کو کافر ذمی کسی مسلمان سے خرید کرے اس میں سے شرعی حکومت اگر صاحب اقتدار ہو تو خمس وصول کرے گی، جسے ایک خصوصی ٹیکس سمجھنا چاہیئے۔

۷ - مال حلال جو حرام سے مخلوط ہو گیا ہو، اس طرح کہ امتیاز نہ ہو اور مالک معلوم نہ ہو اس صورت میں خمس دینا لازم ہوگا۔ اور اگر معلوم ہو کہ مال حرام کی مقدار خمس سے زیادہ ہے تو خمس ادا کرنے کے بعد جتنی مقدار کا اس سے زیادہ علم ہے اسے مالک جائز کی طرف سے راہِ خدا میں تصدق کر دے۔

اس سلسلہ میں مزید تشریح یہ ہے کہ اگر ایسے مال سے مال غیر کے

مخلوط ہو جانے کی چار صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ مقدار مال اور مالک مال دونوں معلوم ہوں اس صورت میں لازم ہے کہ اس مقدار مال کو اس مالک کے پاس پہنچائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مقدار مال معلوم ہو اور مالک معلوم نہ ہو۔ اس صورت میں اس مقدار مال کو یا بطور امانت اپنے پاس رکھے یا اس مالک کی طرف سے راہِ خدا میں خیرات کر دے۔ اس ارادے کے ساتھ کہ اگر مالک کا پتہ چل گیا اور وہ اس خیرات سے راضی نہ ہوا تو میں اس کا معاوضہ اسے ادا کر دوں گا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مالک معلوم ہو اور مقدار معلوم نہ ہو۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس مالک سے سمجھوتہ کرے، اس طرح کہ وہ راضی ہو جائے۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ مقدار مال اور مالک دونوں نامعلوم ہوں۔ یہ صورت وہ ہے جس میں خمس نکال کر باقی مال اس شخص کے لئے حلال و مباح ہو جاتا ہے۔

نصاب

ع۱ اموالِ غنیمت اور ۵ فاضل آمدنی سالانہ اور ۶ کا فردی کی مول لی ہوئی زمین اور ۷ مال حرام میں مخلوط ہو جانے والے مال حلال۔ ان چار قسموں میں کوئی نصاب نہیں ہے۔ جتنا بھی مال اس قسم کا ہو چاہے قلیل ہو چاہے کثیر اس میں خمس واجب ہو گا۔ مگر ۲، ۳ اور ۴ یعنی معادن و کنوز اور غواصی سے برآمد شدہ

مال میں نصاب مقرر ہے کہ اس سے کم اگر ہو تو خمس کی ضرورت نہیں ہے۔ معادن اور کنوز میں اگر سونا ہو تو بیس دینار اور اگر چاندی ہو تو دو سو درہم نصاب ہے۔ اور اگر کوئی اور شے ہو تو اس کی قیمت کے لحاظ سے ۲۰ دینار یا ۲۰۰ درہم، جو پورے ہوتے ہوں اس میں خمس واجب ہوگا اور غوطہ زنی والی چیزوں میں باعتبار قیمت ایک دینار کی مالیت معتبر ہے۔

مستحقین خمس

خمس کے چھ حصے ہوتے ہیں:-

(۱) سہم خدا (۲) سہم رسولؐ (۳) سہم ذوالقربیٰ

یہ تینوں حصے اب امامؑ کا حق ہیں، اور غیبت امامؑ کے دور میں انھیں کسی ایسے مصرف میں صرف ہونا چاہیے جس میں رضائے امامؑ کا زیادہ سے زیادہ یقین ہو اور تین حصے فقراء اور ایتام اور ابناء السبیل کے ہیں جو سادات میں ہوں اور سال بھر کے بسر اوقات کا ذریعہ نہ رکھتے ہوں۔

۱؎ دینار ۳ ماشے ۳ رتی سونا، اور درہم ۲ ماشے $2\frac{1}{2}$ رتی

۲؎ خمس رتی بھر چاندی ہے (رسالہ تاج العلماء)

نظامِ خمس پر ایک جامع تبصرہ

خمس کا نظام درحقیقت ایسا ہمہ گیر نظام ہے جس کے پورے طور پر رائج ہونے کے بعد کسی بڑی سے بڑی دینی و اجتماعی مہم میں، جو امورِ خیر میں داخل ہو، کبھی کسی چندے اور خصوصی ٹیکس کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔

اس میں خدا و رسولؐ اور ذوالقربیٰ کا جو حق ہے جسے حقِ امامؑ کہتے ہیں۔ یہ درحقیقت ان شخصیتوں کے فائدہ کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ دینی حیثیت سے امامؑ وہ حقیقی طاقت ہے جو مفادِ کل کی ذمہ دار ہے۔ اس لئے اسے امامؑ کا حق قرار دینا ایک ایسے قومی سرمایہ کا سرچشمہ ہے، جس سے شخصی نہیں بلکہ اجتماعی مقاصد پایۂ تکمیل تک پہنچیں۔

چونکہ خمس ایک دینی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی تحریک خود افرادِ امت کا ضمیر کرتا ہے، اس لئے سیاسی اقتدار کچھ دوسرے افراد کے پاس ہونے کے بعد بھی ملت کا ضمیر اگر بیدار ہو تو ان کا اقتصادی نظام اپنے دینی و قومی مفادات کے پورا کرنے کا بحسن و خوبی خود کفیل ہو سکتا ہے۔ جس کی شہادت ائمہ اہلبیتؑ کے دور کے ان واقعات سے ہوتی ہے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح وقت کی تمام ناسازگار فضاؤں کے باوجود افراد شیعہ کے ضروریاتِ زندگی کی کفالت یہ حضرات فرماتے رہتے تھے

اور اسی سے اس سیاست کا راز بھی ظاہر ہو جائیگا جو باوجود نص قرآن جمہوری شریعت میں خمس کے فریضہ پر قلم نسخ پھیر دینے کی متقاضی ہوئی۔

آج بھی عراق یا ایران کا ذکر نہیں۔ جو ہم سے دور ہیں اپنے قریب افریقہ، بمبئی، کراچی یا لاہور کے اُن حلقوں کے جماعتی نظام پر اگر غور کیا جائے، جو خمس نکالنے کے پابند ہیں تو معلوم ہوگا کہ اگر تمام افرادِ ملت ہر شہر اور دیہات میں اس فریضہ کے پابند ہو جائیں تو آج ہمارا اقتصادی نظام کس طرح دوسروں کے لئے قابلِ رشک بن کر قائم و مستحکم ہو سکتا ہے۔

(۵۱) حج

فریضۂ حج کی اہمیت

حج کو اسلامی عبادات میں بڑی اہمیت ہے۔ قرآن مجید میں ترک کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔ وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلاً و من کفر فان اللہ غنی عن العالمین (یعنی) "اللہ کے لئے خلق خدا پر خانۂ کعبہ کا حج لازم ہے، اس شخص پر کہ جو اس کی استطاعت رکھتا ہو اور جو کفر اختیار کرے اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے" مطلب یہ ہے کہ اس کفر کو اختیار کر کے برا کرے گا تو اپنا کرے گا۔ اللہ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

حج کا تاریخی آغاز

فریضۂ حج کا حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ کے ہی دور میں حکم نہیں آیا بلکہ اس کو بڑی قدیم تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی حضرت ابراہیم خلیل اللہ جب اپنے فرزند جناب اسمٰعیل کی شرکت میں سرزمین مکہ پر خانۂ کعبہ کی تعمیر کر چکے تو اس وقت قرآن کی لفظوں میں فرمان الٰہی جاری ہوا وأذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق "تم تمام خلائق میں حج کی منادی کر دو جس پر تمام لوگ تمہاری آواز پر دوڑ پڑیں گے، پیادہ پا یا سواریوں پر، دور دراز مقامات سے سب اس طرف آیا کریں گے جناب ابراہیم کے بعد عرب میں یہ عملدرآمد قائم رہا یہاں تک کہ

مشرکین بھی اسے بجا لاتے تھے۔ بے شک انھوں نے اس میں بہت سی بے ہودہ باتیں شریک کر دیں تھیں جیسے کہ برہنہ طواف کرنا حضرت پیغمبر اسلام ؐ نے بس ان بیہودہ باتوں کا خاتمہ کر کے فریضۂ حج کو اُس کی اصلی شان کے ساتھ قائم و برقرار رکھا۔

حج کیا ہے؟ حج کے لغوی معنی تو قصد کرنے کے ہیں اور شریعت اسلام میں وہ ایک مسلمان کا ایک خاص زمانہ میں ملک حجاز کی سرزمین مکہ معظمہ پر خوشنودی خدا کے لیے اُن خاص افعال کا ادا کرنا ہے جن کا ارکان و اجزاء حج میں بیان مختصر طریقہ پر اس کتاب میں آئے گا۔

حج کس لیے؟ تمام عبادات کا اصل مقصد خلق خدا میں اس حاکم بالا دست کے وجود کا احساس قائم رکھنا ہے جو کائنات میں خیر و صلاح اور انسان سے بلندی کردار و اخلاق کی پابندی کا طلب گار ہے۔

۱ اس حاکم کے وجود کے احساس ہی سے انسان میں مطلق العنانی لذت پرستی اور خود کامی پیدا نہ ہونے پائے گی اور وہ جامعہ بشری کی ایک اچھی فرد بن سکے گا۔

چونکہ اس میں سد راہ انسان کے نفسانی جذبات اور طبعی لذائذ ہوتے ہیں، اس لیے رسوم عبادت کے ذیل میں ہر شخص کو

مختلف نفسانی خواہشوں کے مغلوب کرنے اور بلند مقاصد کے لئے کچھ دنیوی مفادات کے قربان کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

بعض عبادات میں اپنے راحت و آرام، کچھ وقت اور جسمانی سکون کی قربانی ہوتی ہے جیسے نماز بعض میں کچھ مادی جذبات اور نفسانی لذائذ کی قربانی ہوتی ہے جیسے روزہ۔ بعض میں مالی قربانی ہوتی ہے جیسے زکوٰۃ و خمس۔

حج کو جب ہم دیکھتے ہیں تو اس میں وہ تمام قربانیاں یکجا ہیں جو دوسرے عبادات میں علیحدہ نظر آتی ہیں[1]

راحت و آرام وغیرہ کی قربانی جو نماز میں ہوتی ہے وہ حج میں بدرجہا زیادہ ہے۔ کہاں تھوڑی دیر کے لیے قیام و قعود اور رکوع و سجود کر لینا اور کہاں سعی و طواف وغیرہ کے افعال جن میں نماز بھی ایک جزو ہے۔ پھر دور افتادہ اشخاص کے لیے سفر کے مراحل و منازل اور اُن میں جو تعب و مشقت در پیش ہو۔

لذائذ نفس کی قربانی جو روزہ میں ہے وہ بھی یہاں احرام کے بعد سے فراغت حج تک ہی اُن باتوں کے ترک رکھنے سے جن کا ترک احرام کے بعد واجب ہے۔

---

[1] پھر بھی نماز تمام عبادات میں افضل ہے غالباً اُس مداومت اور استمرار کی وجہ سے جو اس کے ہر دن کم از کم پانچ مرتبہ ادا کرنے کی بنا پر دریا افادیت کی حامل ہے۔

اور مالی قربانی جو زکوٰۃ وغیرہ میں ہوتی ہے وہ یہاں جس دور دراز مسافت سے حج کے لیے آئے اس کی دوری کے تناسب ہے ہی۔

اس سے ماورا بیشتر اشخاص کو وطن کی قربانی اور مفارقت اہل وعیال وغیرہ کی قربانی بھی برداشت کرنا پڑتی ہے اور اس طرح وہ اُن تمام مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے جو دوسرے عبادات میں ہیں۔

پھر تمام نقاط ارض کے مسلمانوں کے ایک ہی سرزمین پر جمع ہونے سے جو اجتماعی شیرازہ بندی مسلمانوں کی ہو سکتی ہے وہ مستقل چیز ہے۔ علاوہ اس کے شعائر حج میں کچھ افعال بعض گزشتہ اہم واقعات کی یادگار کے طور پر ہیں جن کی یاد کا تازہ کرنا دینی احساسات کی بیداری کا ذریعہ ہے۔

شرائط حج

شریعت اسلام میں انسانی فطرت کے تقاضوں کو نظرانداز نہیں کیا گیا ہے اور غیر معمولی مشقت و زحمت میں ڈالنا نہیں چاہا گیا ہے چنانچہ حج اول تو ہر انسان پر عمر میں صرف ایک بار واجب قرار دیا گیا ہے۔ جب ایک مرتبہ حج بجا لے آئے تو پھر دوبارہ حج کی کوئی قانونی پابندی نہیں ہے۔ ہاں حصول ثواب کے لیے اپنی خوشی سے ہر سال حج کرے تو بھی بہتر ہے اس کے علاوہ وہ ایک دفعہ بھی جو حج واجب ہوتا ہے وہ چند شرطوں کے ساتھ۔ اگر ان شرطوں میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو حج واجب نہیں ہوگا۔

ان میں سے دو شرطیں تو وہ ہیں جو تمام واجبات میں ہیں یعنی بلوغ اور عقل یہ قانون شرع کی لازمی شرطیں ہیں جن کے بغیر کوئی ذمہ داری عائد ہی نہیں ہوتی ۔

بلوغ کی حد لڑکی کے لیے ۹ برس اور لڑکے کے لیے پندرہ برس کی ہے اور عقل کا معیار یہ ہے کہ مجنون و دیوانہ نہ سمجھا جا سکے ۔

اس کے علاوہ حج کے واجب ہونے میں یہ خاص شرط ہے کہ استطاعت رکھتا ہو یعنی مکہ معظمہ تک پہنچنے اور وہاں سے اپنی منزل تک جانے نیز زمانہ سفر میں اہل و عیال کے بسر اوقات کے لیے ضروری مصارف کا سامان پاس موجود ہو خواہ بصورت نقد ہو یا ایسا ذریعہ جو قابل اطمینان ہے ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو حج واجب نہیں ہو گا ۔

یہاں تک کہ اگر یہ غیر ہے مگر کوئی رئیس اسے اپنے پاس سے لیجائے اور اس کے اہل و عیال کی بسر اوقات کا سامان کرنے کے لئے تیار ہے تو بھی اسے حج کے لیے "منت غیر" لینا فرض نہیں ہے بلکہ اسے جائز ہے کہ یہ انکار کر دے اور کہے جب خدا خود مجھے دے گا اُس وقت حج کروں گا اس طرح میں حج کرنا نہیں چاہتا ۔

ہاں اگر رئیس نے اسے اتنی رقم دی کہ جو مصارف حج کے لیے کافی ہے اور اس نے وہ رقم لے بھی لی تو اب اس پر حج کرنا واجب ہو جائے گا اب یہ نہیں جائز ہو گا کہ اس رقم کو تو یہ اپنے دوسرے مصارف میں ختم کر دے اور حج کے لیے اس کا انتظار کرے کہ جب اپنے پاس ذاتی روپیہ ہو گا تو حج کو جاؤں گا ۔ اگر ایسا کرے گا تو حج

www.kitabmart.in

اس کے لیے واجب الادا رہے گا اور یہ اُس کے ترک پر مستقل طور پر گناہ گار رہے گا۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی جسمانی صحت ایسی ہو کہ یہ سفر کا متحمل ہو سکتا ہو۔ نیز راستہ پر امن ہو جان و مال یا آبرو کیلئے خطرہ نہو۔

اقسام حج حج کی شریعت اسلام میں تین قسمیں ہیں:- ایک حج افراد۔ دوسرے حج قران۔ اور تیسرے حج تمتع۔

پہلی دو قسم کے حج اُن لوگوں کے لئے ہیں جو خاص مکہ معظمہ میں یا مکہ معظمہ سے ۴۸ میل دور کے اندر رہتے ہوں اور حج تمتع اُن کے لئے ہے جن کا مقام سکونت مکہ معظمہ سے ۴۸ میل شرعی یا اس سے زیادہ دور ہو۔

ان اقسام کا فرق حج تمتع میں دو مرتبہ احرام باندھا جاتا ہے ایک مرتبہ عمرہ کی نیت سے اور اس کے بعد طواف کعبہ اور صفا و مروہ کے درمیان سعی اور تقصیر یعنی بال اور ناخون کا ٹنا ہوتا ہے اور اس کے بعد اس احرام کی پابندیاں ختم یہاں تک کہ طواف النساء کے بعد مباشرت کی پابندی بھی دور ہو جاتی ہے اس کے بعد پھر حج کا احرام باندھا جاتا ہے اور اس احرام کے بعد عرفات میں وقوف اور مشعر الحرام میں جا کر قیام اور منیٰ میں قربانی اور سر منڈوانا یا بال کتروانا اور پھر خانہ کعبہ کے طواف کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی اور پھر طواف النساء اور آخر میں پھر منیٰ میں قیام اور رمی جمرات ہوتا ہے۔

www.kitabmart.in

لیکن حج قران وافراد میں بس ایک ہی احرام حج کے لئے باندھا
جاتا ہے۔ اس احرام کو باندھکر عرفات میں وقوف وغیرہ اعمال جو بیان
ہوئے بجالائے جاتے ہیں۔ قبل والے اعمال جو عمرہ کے احکام کے ساتھ
وہاں بجالائے جاتے تھے یہاں نہیں ہوتے۔

قران اور افراد دونوں کی شکل بالکل یکساں ہے۔ صرف اتنا
فرق ہے کہ قران میں احرام کے ساتھ ہی اپنے ساتھ قربانی کے جانور لے
جانا ہوتے ہیں اور افراد میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

حج تمتع کی بحث

قرآن مجید میں صراحۃً موجود ہے:۔
فمن تمتع بالعمرۃ الی الحج فما استیسر من الھدی
(سورہ بقر) ترجمہ:۔ "جو عمرہ بجالانے کیساتھ حج کا احرام باندھنے تک تمتع کر رہا ہو
تو جو ممکن ہو قربانی کرے"

اس کے بعد کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ مسلمانوں کے درمیان
حج تمتع میں کوئی اختلاف پیدا ہو مگر افسوس ہے کہ اس میں اختلاف پیدا
ہوا اور وہ اس طرح کہ حضرت عمر نے اپنے دور میں اور پھر عثمان نے آپ نے
نا پسند کیا اور اس سے مخالفت کی۔ اس لئے اہل سنت اسی منع پر قائم
ہو گئے۔ حالانکہ نص قرآنی اور سنت حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کے مقابلہ میں کسی شخص کی رائے کا کوئی وزن نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر
صحیح بخاری میں صاف عنوان قائم کیا ہے۔ باب التمتع والقران والافراد
بالحج۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام میں تین قسم کے حج ہوتے تھے
اس باب میں دو حدیثیں درج کی ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ خلیفہ

www.kitabmart.in

سوم عثمان کی طرف سے حج تمتع کی ممانعت ہوئی تو حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے فرمایا جس کے الفاظ ایک حدیث میں یہ ہیں ما کنت لادع سنۃ النبی لقول احد " میں کسی کے قول کی وجہ سے پیغمبر خداؐ کی سنت کو ترک نہیں کر سکتا " دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے خود عثمان سے کہا " ما ترید الی ان تنھی عن امر فعلہ النبی " " آخر تمہارا کیا مطلب ہے کہ تم اُس چیز کی مانع ہو جسے خود پیغمبر خداؐ عمل میں لائے ہیں " ؎۱

ایسے ہی دیگر صحاح و سنن اور تفاسیر میں کثیر التعداد ثبوت موجود ہیں جن کے بعد اس مسئلہ میں کسی مسلمان کو گنجائش انکار باقی نہیں رہتی۔

افعال حج

مکہ معظمہ میں باہر سے آنے والوں کے لیے ہر رخ پر ایک جگہ مقرر رہے جہاں سے وہ حج کا لباس پہنتے ہیں اور خاص طور پر حج کا قصد کر کے کچھ پابندیاں اختیار کرتے ہیں جسے احرام باندھنا کہتے ہیں۔ اس جگہ کو " میقات " کہا جاتا ہے۔

ہندوستان سے جانے والوں کے لیے میقات ایک مقام ہے جس کا نام یلملم ہے۔ بغیر احرام باندھے میقات سے مکہ کی جانب آگے بڑھنا حرام ہے اگر سمندر کی راہ سے جدہ جانے کی شکل میں خود یلملم پہنچنا نہیں ہوتا اس لئے جدہ میں پہنچکر احرام باندھا جاتا ہے۔ اور اگر مدینہ منورہ کی زیارت کو پہلے جائیں تو مدینہ سے نکل کر بمقام بیر علی میں احرام باندھنا ہوگا۔ اسطرح حج تمتع میں جو دور والوں کے لئے فرض ہے افعالِ حج حسب ذیل ہوتے ہیں۔

؎۱ صحیح بخاری مطبوعہ مصر جلد ۱ ص ۱۷۵)

www.kitabmart.in

(۱) عمرہ تمتع کا احرام۔ نیت یعنی ذہن میں یہ قصد کریں عمرۂ تمتع کا جو واجب ہے حجۃ الاسلام کے لیے احرام باندھتا ہوں قربۃً الی اللہ یعنی خوشنودی خدا کے لیے۔

یہ ویسی ہی نیت ہے جیسی نماز وغیرہ تمام عبادتوں میں ضروری ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ فعل شعوری طور پر ہو اور اس کے پس منظر میں حکم الٰہی کی تعمیل کا جذبہ موجود ہو۔ صرف مخلوق خدا کو دکھانے یا کسی پست غرض کو سامنے رکھکر اس عمل کی بجا آوری نہ ہو ورنہ وہ عمل باطل ہو گا۔ یعنی اُس کے ذریعہ سے وہ فریضہ جو اس کے ذمہ تھا ادا نہ ہوگا۔

مذکورہ بالا نیت کے ساتھ تلبیہ کہے یعنی لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ (یعنی) "حاضر ہوں۔ پروردگار حاضر ہوں کوئی تیرا خدائی میں شریک نہیں۔ تیری بارگاہ میں حاضر ہوں" معلوم ہوتا ہے جیسے خالق کی طرف سے اسے پکارا جا رہا ہے اور یہ اس پکار پر اپنے اہل و عیال اور وطن کو چھوڑ کر روانہ ہوا ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ اگر حقیقت کا تصور ہو جائے تو یہی انسان کی زندگی میں انقلاب اور مکمل نظم و ضبط پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ہمارے چوتھے امام حضرت زین العابدین کا واقعہ ہے کہ آپ نے ایک بار اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ کی صدا بلند کی تو دفعتاً غش کھا کر ناقہ سے نیچے زمین پر گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو فرمایا مجھے تصور ہو گیا کہ میں اس بارگاہ میں حاضر ہونے کے لائق بھی ہوں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے کہا لبیک حاضر ہو رہا ہوں اور ادھر سے آواز آ گئی ...

www.kitabmart.in

کے ساتھ دو کپڑے احرام کے پہنے ایک کو بطور تہ بند باندھے اور دوسرے کو چادر کے طور سے کندھے پر ڈالے۔ دونوں کپڑے سلے ہوئے یا بنیائن وغیرہ کی طرح بنے ہوئے نہ ہوں نہ ریشم وغیرہ کے ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس طرح بڑے بڑے نفاست پسند اور امیرانہ ٹھاٹھ والے افراد کو اُس سادگی کے اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا ہے جس کے بعد اُن میں اور غریبوں میں کوئی امتیاز نہ رہ جائے۔ یہ روح مساوات کے پیدا کرنے کی وہ عملی تدبیریں ہیں جنھیں شریعت اسلام نے اپنے احکام میں برابر مدنظر رکھا ہے۔

بے شک عورتوں کے لیے اُن کے پردہ کے تحفظ کی غرض سے یہ خصوصی مراعات رکھی گئی ہے کہ وہ سلا ہوا کپڑا پہن سکتی ہیں۔ اس سے نظر شریعت میں پردہ کی اہمیت ثابت ہوتی ہے جو دوسرے قوانین میں اکثر تبدیلی کا باعث بن جاتی ہے۔

مذکورۂ بالا طریقہ سے احرام باندھنے کے بعد حسب ذیل امور ہیں جو اس شخص پر حرام ہو جاتے ہیں:-

(۱) خود شکار کرنا یا دوسرے کو پتہ بتانا۔ آلات شکار کا دینا یا کسی اور طرح اعانت کرنا۔

(۲) مقاربت یا عقد نکاح کرنا۔

(۳) نکاح کا گواہ ہونا یا گواہی دینا۔

(۴) خوشبو سونگھنا۔

(۵) کسی بدبو سے ناک بند کرنا۔

www.kitabmart.in

(۶) تیل لگانا

(۷) سیلے یا بنے ہوئے کپڑے پہننا۔

(۸) ایسے جوتے یا موزے پہننا جن سے پشت پا پوشیدہ ہو جائے۔

(۹) زینت کی غرض سے انگوٹھی پہننا۔

(۱۰) مرد کو سر اور کانوں کا ڈھانکنا یا پانی میں غوطہ لگانا یا سر کا ڈبونا۔

(۱۱) مرد کو سفر کی حالت میں چھتری یا درخت کے نیچے سایہ میں چلنا۔

(۱۲) سر یا بدن سے بال اکھاڑنا۔

(۱۳) ناخون کاٹنا خواہ ایک ہی انگلی کا ہو۔

(۱۴) جوں وغیرہ کا مارنا یا جسم سے الگ کرنا۔

(۱۵) بہ قصد زینت سیاہ یا سرخ سرمہ لگانا۔

(۱۶) بطور زینت مہندی لگانا۔

(۱۷) آئینہ دیکھنا۔

(۱۸) دانت یا ڈاڑھ اکھڑوانا۔

(۱۹) بغیر خطرہ ہتھیار لگانا یا اپنے پاس رکھنا۔

(۲۰) بدن سے خون نکالنا یا نکلوانا۔

(۲۱) جھگڑے کے موقع پر لاواللہ یا بلی واللہ کی قسم کھانا

(۲۲) عورت کو بقصد زینت زیور پہننا

(۲۳) کسی شخص کو یہاں تک کہ اپنے شوہر یا کسی محرم کو اپنا سنگار دکھانا۔

(۲۴) عورت کو بغیر نامحرم کے اپنے چہرے پر دھوپ وغیرہ کے خیال سے نقاب ڈالنا۔

www.kitabmart.in

(۲۵) عورت کو دستانے پہننا۔

(۲۶) بلا تفریق مرد و زن ہر ایک کے لیے جھوٹ بولنا گالی دینا یا کسی گناہ کا مرتکب ہونا۔

(۲۷) حرم کی گھانس یا درخت کا توڑنا اور کاٹنا۔

مذکورہ بالا پابندیوں پر ایک سطحی نظر بھی یہ سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ احرام کے بعد ایک مقررہ مدت تک انسان کو کتنے سخت ضبط نفس کی مشق کرائی جارہی ہے اور جو اس میں کامیاب ہو اسے کتنا نفسانی خواہشوں پر قابو حاصل کرنے کا ملکہ پیدا ہو سکتا ہے۔

احرام کے بعد داخلِ حرم ہو اور باوضو عمرہ تمتع کے طواف کی نیت سے سات بار خانہ کعبہ کے گرد پھرنا لازم ہے۔ اس کے بعد مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز طواف ادا کرے۔ اس کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی کرے۔ پھر تقصیر کرے یعنی بال اور ناخون کٹوائے جس کے بعد عمرہ تمتع پورا ہو جاتا ہے اور بعض امور جو حالت احرام میں حرام تھے حلال ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اب اپنا عام لباس پہن سکتا ہے اور طواف النساء کے بعد جائز عورت سے مباشرت بھی درست ہے مگر شکار وغیرہ کی حرمت ایسے احکام جو حرم کے احترام کی بنا پر ہیں اب بھی قائم رہتے ہیں اور حج بجالانے سے پہلے حدود حرم سے باہر نکلنا بھی جائز نہیں۔ اس کے بعد آٹھویں ذی الحجہ سے دوبارہ حج کا احرام باندھا جائے گا۔ یہ احرام مکہ معظمہ ہی میں باندھا جاتا ہے۔ باقی احکام اس احرام کے وہی ہیں جن کا احرام عمرہ میں بیان ہو چکا۔

www.kitabmart.in

اب احرام باندھنے کے بعد عرفات جائے اور وہاں وقوف کرے یعنی
زوال آفتاب سے شام تک وہاں ٹھہرا رہے۔ بعد شام عرفات سے
مشعر الحرام کو جائے اور طلوع آفتاب تک وہاں قیام کرے۔ طلوع آفتاب
کے بعد مشعر الحرام سے منیٰ میں جائے اور عید الاضحیٰ کے دن یعنی دس ذی
الحجہ کو جمرہ عقبہ پر سات کنکریاں ایک ایک کر کے مارے۔ یہ کنکریاں
حرم کی سرزمین سے اٹھائی جاتی ہیں اور اس طرح ماری جاتی ہیں کہ
ستون پر جا کر پڑتی ہیں۔

اس کے بعد یہیں منیٰ میں اونٹ، گائے، بکری، دنبہ ان میں سے کسی
ایک جانور کی قربانی کی جاتی ہے۔

قربانی کے بعد ایسے شخص کو جو پہلے پہل حج کو گیا ہو یہ لازم ہے کہ وہ
اسی دن سر منڈوائے اور عورتیں تھوڑے سے بال ترشوالیں۔ اسی طرح
مرد اگر پہلے کبھی حج کر چکا ہے اور دوبارہ گیا ہے تو سر کا منڈوانا واجب
نہیں ہے، کتر دالینا بالوں کا کافی ہے۔

یہ سب کام منیٰ میں جب انجام پا جائیں تو جا کر خانہ کعبہ کا طواف کرے
اور دو رکعت نماز طواف پڑھے جس کے بعد خوشبو حلال ہو جاتی ہے پھر صفا
و مروہ کے درمیان سعی کرے اور آخر میں پھر طواف النساء کرے اور دو رکعت
نماز طواف بجا لائے جس کے بعد پھر جائز عورتوں سے مباشرت صحیح ہو جاتی
ہے۔

اس کے بعد ذی الحجہ کی گیارھویں یا بارھویں شب منیٰ میں بسر
...

www.kitabmart.in

تینوں پر علی الترتیب سات سات کنکریاں مارنا لازم ہے جس کے بعد حج مکمل ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد خانہ کعبہ کے وداع کے لئے مکہ معظمہ پلٹنا سنت ہے اور پھر مدینہ منورہ جاکر روضہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت سنت موکدہ ہے جسے ہرگز ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ قبل حج بھی زیارت کو جانا درست ہے اس صورت میں پہلے اگر مکہ معظمہ میں داخل ہو تو اس کے پہلے احرام عمرۂ مفردہ کا باندھنا چاہئے اس لیے کہ عمرۂ تمتع کے احرام کے بعد پھر بغیر حج کیے مکہ سے نکلنا جائز نہیں ہوگا۔

www.kitabmart.in

(۶) جہاد

جہاد اسلام کے عملی ارکان میں ایک بڑا رکن ہے مگر افسوس ہے کہ اس بارے میں غیروں میں بھی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور اپنوں میں بھی۔

افراط و تفریط کے دونوں غیر معتدل پہلوؤں میں لوگ ادھر چلے جاتے ہیں تو یہ ادھر، اور نتیجہ میں اپنی غیر معتدل روش سے یہ اُن کی آوازوں کو قوت پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

جہاد کے معنی جہاد کی لفظ لغوی حیثیت سے جہد سے بھی ہو سکتی ہے جس کے معنی کوشش کے ہیں اور جُہد سے بھی جس کے معنی طاقت و استطاعت کے ہیں۔ باب مفاعلت میں جانے کی وجہ سے اس میں مقابلہ کا مفہوم پیدا ہوا ہے پہلی صورت میں معنی ہوتے ہیں کہ کوشش میں مقابلہ اور دوسری صورت میں طاقت و قدرت میں مقابلہ

اصطلاح شریعت میں وہ اہل باطل سے تلوار لے کر مقابلہ کا نام ہوگیا ہے اور اسی کے احکام کا بیان یہاں نصب العین ہے۔

قتال اور جہاد چونکہ ملک کی سیاسی جنگ میں ایک بڑی مسلم جماعت نے ملک کے سیاسی رہنما کے زیر قیادت "عدم تشدد" کے اصول پر عمل کیا اور اس لیے اس اصول نے ذہن و دماغ پر ایک طرح کا تسلط حاصل کیا اور اسلام کی تعلیم جہاد انھیں اس نظریہ کے خلاف معلوم ہوتی تھی لہٰذا انھوں نے اپنے سیاسی رجحانات کے ساتھ اپنے اسلام کو محفوظ رکھنے کے لئے جہاد کے لغوی معنی سے فائدہ اٹھا کر یہ کہا کہ جہاد راہ حق میں اہل باطل کے بالمقابل کوشش کا نام ہے

www.kitabmart.in
www.kitabmart.in

لہذا یہ "مفاومت مجہول" کی قسم کے مقابلہ پر بھی منطبق ہے مگر اسے کیا کیا جائے کہ قرآن مجید میں حکم جہاد لفظ جہاد سے تو کم مقامات پر ہے۔ زیادہ تر لفظ قتال کے ساتھ ہے اور قتال کی لفظ صاف قتل سے ہے جس کے معنے مار ڈالنے کے ہیں لہذا اس میں صریحاً خون ریز مقابلہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ارشاد ہوتا ہے کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم وعسیٰ ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئا وھو شر لکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون۔

یہ کُتِبَ کی لفظ وہی ہے جو روزہ کے ساتھ استعمال ہوئی ہے یا ایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام یعنی یہ ہوئے کہ تم پر مرنے مارنے کا راہ خدا میں فریضہ عاید کیا گیا ہے اور یہ تمھیں شاق و ناگوار ہے مگر بہت ممکن ہے کہ کسی شے کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ درحقیقت تمھارے لئے بہتر ہو اور بہت ممکن ہے کہ کسی چیز کو تم پسند کرتے ہو اور وہ تمھارے لئے بُری ہو۔ بات یہ ہے کہ اللہ علم رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے۔

اس میں قانون جہاد کے حکیمانہ مصالح کیطرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگرچہ شخصی حیثیت سے اس میں اتلاف جان ہوتا ہے مگر نوع انسانی کے لیے اس کے نتائج بہتر ہوتے ہیں۔ اس لیے خالق حکیم کی طرف سے اس کا فریضہ عائد کیا جانا ضروری ہے۔

دوسری آیت :- "وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ" "اس حد تک ان سے جنگ کرو کہ فتنہ و عناد ختم ہو جائے"

www.kitabmart.in

تیسری آیت:۔ وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین " اللہ کی راہ میں جنگ کرو اُن سے کہ جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے تم آگے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

چوتھی آیت:۔ وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان " تمھیں کیا ہے کہ نہیں جنگ کرتے تم اللہ کی راہ میں اور اُن کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جنھیں ستایا جاتا ہے اور اُن کا کوئی مددگار نہیں۔"

پانچویں آیت:۔ یا ایھا النبی حرض المؤمنین علی القتال " اے پیغمبر مومنین کو جنگ پر آمادہ کیجیے۔"

چھٹی آیت:۔ ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون " بلا شبہ اللہ نے خرید لیا ہے مومنین سے اُن کے جان و مال کو اس کے عوض میں کہ اُن کے لیے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں۔"

ساتویں آیت:۔ " وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احدھما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفیئ الی امر اللہ " اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں جنگ کر رہے ہیں تو دونوں میں صلح کرا دو لیکن اگر ایک دوسرے کے خلاف باغی کی حیثیت رکھتا ہو تو اس باغی گروہ سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی

www.kitabmart.in

کی طرف رجوع کرے "۔

اس کے علاوہ بھی بہت جگہ قرآن مجید میں اسی لفظ قتال سے اس فریضہ کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ہاں اسے بعض مقامات پر جہاد کی لفظ سے یاد کیا گیا ہے ۔ جیسے جاھدوا فی اللہ حق جہادہ یا ایھا النبی جاھد الکفار فضل اللہ المجاھدین علی القاعدین ۔ اگران آیات میں لغوی معنی کی بنا پر اس لفظ کو مبہم بھی مانا جائے تو گزشتہ آیات کی تفصیل اس ابہام کو دور کر دیتی ہے ۔ پھر یہ کہ لفظ جہاد کے ساتھ اکثر آیتوں میں باموالھم و انفسھم کی لفظ یعنی "جان و مال کے ساتھ" خود اس لفظ کے ابہام کو دور کر دینے کے لئے کافی ہے اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ جہاد اُس مقابلہ کا نام ہے جس میں جان اور مال دونوں صرف ہوتے ہیں اور وہ وہی ہے جسے پہلی آیتوں میں قتال کی لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور جس میں عدم تشدد اور مقاومتِ مجہول یا جہاد بالقلم واللسان وغیرہ کے مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔

جہاد پر عقلی بحث امامیہ مشن کے رسالہ "صلح اور جنگ" میں اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، لہذا یہاں اجمالی طور سے اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے ۔

جس طرح بہت سے مسائل میں عام انسانی دماغ افراط اور تفریط میں مبتلا رہتے ہیں اسی طرح امن اور جنگ کے بارے میں بھی انسان دو حلقوں میں تقسیم ہو گئے، ایک طرف ہٹلر والا نظریہ کہ انسانی زندگی کا مقصد جنگ کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا اور دوسری طرف بعض

www.kitabmart.in

کا مطلق عدم تشدد والا اصول کہ چاہے جو کچھ ہو کبھی تلوار ہاتھ میں نہ لو اور خوں ریزی کے لیے تیار نہ ہو۔

یہ دونوں تعلیمیں اپنی عمومی حیثیت میں انسانیت کے لیے مفید نہیں ہو سکتیں۔ اگر ہر فرد انسانی اور ہر جماعت اس خیال پر چل پڑے کہ ہمیں دوسرے سے مقابلہ کرنا چاہیئے اور ہمیشہ لڑتے رہنا چاہیئے تو تصادمات کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو جائے گا اور پوری نوع بشر میں فنا کے گھاٹ اتر جائے گی۔

اسی طرح مطلق عدم تشدد بھی ہمیشہ نوع انسانی کے لیے مفید نہیں ہے، عدم تشدد اصلاح کا ذریعہ اسی وقت تک ہے جب تک فریق مقابل میں اتنی انسانیت ہے کہ وہ حلم وتحمل کی قدر کر سکے لیکن اگر کوئی فریق ان چیزوں سے متاثر ہونے کے قابل نہیں رہا ہے تو ایسی صورت میں عدم تشدد، تشدد میں اضافہ کا باعث ہے۔ ایک رخسار پر طمانچہ پڑنے کے بعد دوسرا رخسار پیش کرنے پر اگر مقابل اتنا شریف ہے کہ شرما کر ہاتھ ہٹالے گا یا اُسے طمانچہ مارنے کے بعد کم از کم پھر دوسروں پر دست تعدی دراز نہ کرے گا تو اس صورت میں یہ رویہ بہت اچھا ہوگا لیکن اگر ایک رخسار پر طمانچہ پڑنے کے بعد دوسرا رخسارہ بڑھانے سے وہ ایسا مشتعل ہو کہ گردن ہی اڑا دے اور پھر تلوار لیکر دوسرے بے گناہوں پر حملہ آور ہو جائے تو یہ رخسار بڑھانا قطعاً کوئی صحیح عمل نہ ہوگا بلکہ وہ دوسرے بیگناہوں کی جان لینے کا ذمہ دار ٹھہرے گا

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح تمام نظام کائنات میں دو چیزیں کارفرما

www.kitabmart.in

ہیں ایک قوت جذب اور دوسرے قوت دفع - ویسے ہی نوع انسان کے لیے باعتبار موقع ومحل دونوں ہی چیزیں ضروری ہوتی ہیں صلح بھی اور جنگ بھی مگر چونکہ قوت دفع کی کارفرمائی اسی وقت ہوتی ہے جب کوئی ناگوار چیز سامنے آئے اور یہ عارضی امر ہے اس لیے امن وصلح جنگ پر مقدم ہے اور جنگ اسی وقت درست ہے جبکہ مناسب طور پر امن وصلح کی گنجائش باقی نہ ہو۔ اس لیے امن وسکون کے لیئے اس سوال کی ضرورت نہیں ہوتی کہ یہ کیوں ہے اور جنگ کے لیے اس پر بحث کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ کس لیے ہے اور اگر کوئی وجہ معقول نہ ہو تو وہ جنگ مورد ملامت ہوتی ہے -

اسی لیے قرآن مجید نے جس کے تعلیمات کا خصوصی جوہر اعتدال ہے موقع کے ساتھ جنگ کی اجازت دی ہے مگر ہر جگہ اس کو فی سبیل اللہ کی قید کے ساتھ مشروط کر دیا ہے یعنی جنگ ایسے مقاصد کی خاطر ہونا چاہیئے جو رضائے رب کا سبب ہیں اور ایسی ہی جنگ کا مذہبی جہاد کے نام سے موسوم ہونا صحیح ہوگا۔

جنگ کے اقسام

تصوری طور پر جنگ کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) مدافعانہ جنگ (۲) جوابی جنگ (۳) ابتدائی جنگ

عقلی طور پر سب سے زیادہ ناگزیر پہلی قسم کی جنگ ہے اور اس کے خلاف مطلق طور پر عدم تشدد کی تلقین جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے عقل وفطرت کے خلاف ہے -

دوسری قسم یعنی جوابی جنگ اس وقت تو ضرور ناروا ہے کہ جب

www.kitabmart.in

فریق مخالف جس نے کبھی ہم پر حملہ کیا تھا اپنے اُن خیالات اور جذبات سے جو محرک جنگ تھے باز آگیا ہو اور اپنے پچھلے اقدام پر پشیمان ہو۔ اس صورت میں اب اُس کے سابق کے کسی حملہ کا جواب دینا جذبۂ انتقام کا غلط استعمال ہوگا لیکن اگر اس نے ہم پر ایک دفعہ حملہ کیا ہے اور اب بھی وہ تیاری میں مصروف اور موقع کا منتظر ہے تو اس صورت میں جوابی حملہ کو عقلاً غلط نہیں سمجھا جا سکتا اگر دنیا میں جرائم کی سزا کا قانون درست ہے اور قصاص کا حق صحیح ہے تو اس قسم کی تادیب بھی درست ہوگی بشرطیکہ اُن ہی حدود میں رہے کہ جن حدود میں مخالف نے ہمارے خلاف اقدام کیا تھا چنانچہ قرآن مجید میں ایسے موقع پر یہ قید لگائی گئی ہے کہ فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم (یعنی) "اس کے خلاف اتنی ہی زیادتی سے کام لو جتنی اس نے تمھارے ساتھ کی ہے"۔

تیسری قسم ــ یعنی ابتدائی جنگ جسے جارحانہ حملہ کہا جاتا ہے اسے سطحی نظر سے دیکھا جائے تب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی صورت میں درست نہیں ہو سکتی۔ لیکن فرض کیجئے کہ آپ صاحب طاقت ہیں اور کوئی شخص یا کوئی جماعت آپ کے علم میں کچھ بے گناہوں کا خون بہا رہی ہے یا کسی دوسری طرح انسانی بلند مقاصد کو پامال کر رہی ہے اور اپنے بڑے بڑے تشدد کے استعمال سے جو اس فرد یا جماعت کے خلاف ہو اس بڑے تشدد کے سلسلہ کا جو اس کے ہاتھوں بے گناہوں کے خلاف جاری تھا سد باب کر سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اس محل پر طاقت کا صرف کرنا مستحسن نہ ہو اور

www.kitabmart.in

ان خرابیوں کے استیصال کے لیے جو بہت عظیم ہیں اُن اشخاص کا استیصال نہ کر دیا جائے جو ان خرابیوں کے ذمہ دار ہیں۔

فی سبیل اللہ کا مطلب

قرآن نے ہر جگہ قتال کو فی سبیل اللہ کی قید کے ساتھ مشروط کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جنگ اُن مقاصد کے تحفظ کے لئے ہونا چاہیے جو اللہ کو پسند ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی ایسی جنگ ممدوح دستحسن نہیں ہو سکتی جو صرف کسی شخص یا جماعت یا قوم کے غلبہ و اقتدار کی خاطر ہو جب تک اس میں "للّٰہیت" نہ ہو۔

سبیل رب کی شناخت میں دشواری

سبیل کے کیا معنی؟ راستا۔ جس کی طرف اضافت ہو اسے اس کی منزل سمجھنا چاہئے جیسے طریق البصرہ۔ یعنی بصرہ کا راستہ۔ ہمارے یہاں لکھنؤ کا راستہ۔ بمبئی کا راستہ وغیرہ۔ اس سب کا کیا مطلب ہے؟ یہ کہ اس راستے پر چل کر وہ منزل ملتی ہے۔ اب یہ تو منزلیں مادی ہیں اس لیے وہ راستے بھی مادی مسافت کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں جسمانی پیروں سے طے کیا جائے مگر وہاں کیا ہے؟ سبیل اللہ "اللہ کا راستا"، تو اس کے کیا معنی ہوئے؟ وہ راستا جس پر چل کر اللہ ملے اور اللہ خود کیونکر ملے گا یعنی اُس کی مرضی ملے۔

اب نہ اللہ کی ذات مادی حیثیت رکھتی ہے نہ اُس کی مرضی تو یہ راستا کب کوئی مادی راستہ ہوگا۔ یہ کردار کا وہ جادہ ہوگا جو خالق

www.kitabmart.in

کے منشار کے مطابق ہو۔ خالق کا منشا معلوم کرنا ہر کس و ناکس کے ہاتھ کی بات ہوتا تو انبیاء و مرسلینؑ کے بھیجنے کی ضرورت کیا تھی؟ پیغمبروں کے آنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ احکام خالق سے خلق کو روشناس بنائیں پھر جب احکام کی عمومی تبلیغ ہو چکی ہے تب بھی خصوصی محل پر اُن کے مصداق کی تشخیص میں غلطیوں کا امکان ہے اب جتنا موقع اہم ہو اتنی ہی غلطی زیادہ ہولناک ہوتی ہے۔

جہاد کی منزل میں معاملہ ہوتا ہے ایک فرد نہیں بلکہ بے شمار افراد کی جان و مال کا۔ ایک تو خود اپنی زندگی اتنی قیمتی شے ہے کہ اس کے تحفظ کے لیے شریعت کے عمومی احکام میں ہمیشہ استثنار ہو جایا کرتا پھر دوسروں کی جانیں اور وہ خون ریزی جس کا سلسلہ بسا اوقات بڑا طولانی ہوتا ہے اور پھر جوابی اور جواب الجوابی اقدامات سے اپنی بھی اور دوسروں کی بھی جانوں کے جانے کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہاں ذرا سی غلطی ایک لامحدود سلسلۂ تباہی کا موجب ہو سکتی ہے۔ اس لئے جہاد کے معاملہ کو نماز اور روزہ کی طرح ہر مجتہد کے انفرادی اجتہاد کے حوالہ نہیں ہونا چاہیے جس میں غلطی بھی ہو تو خطار اجتہادی کی وسعت اس کی معافی کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ اس بنار پر فقہ امامیہ میں جو حقیقی شریعت اسلامیہ کی ترجمانی کی حیثیت سے اہل بیت رسولؐ علیہم السلام کے ہدایات کے ماتحت مرتب ہوئی ہے سوا جہاد کی اس قسم کے جو خطرات کے سر پر آنے کے بعد صرف تحفظ خود اختیاری کے طور پر ہوتی ہے جس کا نام دفاع ہے

www.kitabmart.in

باقی ہر طرح کے اسلحہ جنگ سے جہاد کو جس میں خوں ریزی کا سوال پیدا ہوتا ہے کسی معصوم رہنما یعنی رسولؐ یا امام کی قیادت اور خصوصی اجازت سے مشروط کر دیا گیا ہے۔ اور اسی بنا پر ہمارے یہاں متفقہ طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ

غیبت امامؑ میں جہاد حرام ہے

دفاع کی قسمیں

دفاع جو کبھی جائز اور اکثر اوقات واجب ہے۔ اس کی چند صورتیں ہیں۔

(۱) خود اپنے یا اپنے اہل وعیال کے جان ومال یا عزت وناموس پر کوئی حملہ آور ہو تو اس کا دفعیہ۔

(۲) ہمارے علم میں کسی مومن یا جماعت مومنین پر جان لینے کے ارادہ سے کوئی حملہ آور ہو اور وہ اپنے دفاع پر قادر نہ ہوں تو اُن کی امداد کے لیے بڑھنا۔

(۳) اسلامی مرکزوں پر جیسے حجاز وعراق کوئی غیر مسلم طاقت تسلط حاصل کرنے کے لیے حملہ آور ہو تو اس کا مقابلہ۔ یہ الاقرب فالاقرب کے اصول پر تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔ یعنی اگر خود ملک والے دفاع پر قادر ہوں تو اُن پر واجب ہے اگر وہ کافی نہ ہوں تو پاس والے ملکوں کے تمام مسلمانوں پر جہاں جہاں تک بقدر کفایت طاقت کے فراہم ہونے کے لیے ضرورت ہو، اس دفاع

www.kitabmart.in

ہیں معروف ہونا لازم ہے۔

یہ واجب کفائی ہے اس معنی سے کہ جب تک کچھ ایسے لوگ
جن میں قوت و طاقت ہے اس فرض کو انجام نہ دیں سب پر واجب
رہے گا اور اس میں پہلوتہی سے سب گنہگار ہوں گے۔ ہاں جب
کچھ لوگ اس فرض کو انجام دے دیں تو باقی سب لوگوں پر
سے ساقط ہو جائے گا۔

ہجرت

غیر مسلم اکثریت والے ملکوں اور شہروں سے اپنے دین کے
تحفظ کے لیے نکلنے کو "ہجرت" کہتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں لفظ "ہجرت" و "مہاجرین" بہت ارزاں
ہوگئی ہے اور اس کا غلط استعمال ہونے لگا ہے۔

اس لفظ کا استحقاق کبھی کسی حرص و ہوس سے انتقال
مکانی کی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ ہجرت صرف اس صورت
میں واجب ہے جب دار الکفر میں انسان اپنے شعائر دینی نماز
روزہ وغیرہ کے انجام دینے پر قادر نہ ہو۔ تو ایسی کھلی ہوئی
فضا کی طرف منتقل ہونا لازم ہے جہاں وہ آزادی کے ساتھ
دینی فرائض پر عمل کر سکے۔ بغیر اس کے ہجرت کرنا واجب
نہیں ہے۔ بلکہ اگر خود غرضی سے کام لے کر یہ نقل مکان
دوسرے مسلمانوں میں ضعف پیدا ہونے اور شعائر دینیہ
کے غلط ... ہو جانے کا باعث ہو تو وہ یقیناً مالک حقیقی کو

www.kitabmart.in

ناپسند ہوگا اور اس پر ہجرت کی مقدس لفظ کا اطلاق اس لفظ کی درحقیقت توہین ہو گا

تمام شد